پُراسرار
وارداتیں
اشتیاق احمد

ایک انوکھا جاسوسی ناول

پُر اسرار وارداتیں

اشتیاق احمد

مکتبہ باغ و بہار (۲۱)
مین بازار ○ اسلام پورہ
(کرشن نگر) ○ لاہور

گذارش

اس سے پیشتر مکتبہ باغ و بہار کے لیے ۲ دو ناول لکھ چکا ہوں ۔ یہ تیسرا ہے ۔ امید ہے پہلے دو ناولوں کی طرح آپ اسے بھی پسند کریں گے ۔

کامران مرزا ، آفتاب اور آصف اس مرتبہ ایک حیرت انگیز کام دکھا رہے ہیں ۔ کہانی ایک بار شروع کرنے کی دیر ہے ، پھر آپ اسے چھوڑ نہیں سکیں گے ۔

آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ۔

اشتیاق احمد
۲۔ شیخ سٹریٹ ۔ اسلام پورہ
لاہور

ترتیب

- پہلی واردات
- میری مدد کرو
- ڈکی بین
- نکل گیا
- شمشاد خاں
- دشمن آ گئے
- خونی مقابلہ
- ہار جیت
- مجرم دار
- پھر آ گئے
- آفتاب اور آصف کی مہارت
- انسپکٹر کامران مرزا کی کہانی
- حیرت انگیز آلہ
- چند سوال

پہلی واردات

خالد محمود اپنے دونوں بچوں اور بیگم کے ساتھ رات کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ پاس ہی ان کا ملازم کھڑا تھا تاکہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً دے سکے۔ کھانے کے کمرے کا ایک دروازہ باغ کی طرف کھلتا تھا۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا، کیونکہ خالد محمود خوشبودار ہوا کی موجودگی میں کھانا کھانے کے عادی تھے۔ اچانک ایک اجنبی اور کھردری آواز نے انہیں چونکا دیا:

"باغ والا دروازہ۔"

جملہ نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کی نظریں بے ساختہ اوپر اٹھ گئیں۔ دروازے میں تین لمبے تڑنگے نوجوان کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر شریر بچوں جیسی مسکراہٹیں تھیں، حالانکہ وہ بچے نہیں تھے... ان کے چہروں پر تو بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جسموں پر پتلونیں اور جیکٹیں تھیں اور ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے پستول تھے۔

"کھول کر کھانا۔" دوسرے کے لب ہلے اور اس نے بھی جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کھانا کچھ اچھی عادت نہیں۔" تیسرے نے جملہ مکمل کر دیا:

"کون ہو تم؟" خالد محمود نے ڈرے بغیر کہا۔ وہ ایک امیر آدمی تھے۔ سرکاری ملازم تھے اور یہ ان کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کچھ لوگ اس طرح غیر قانونی طور پر ان کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"ہمارے نام ..." پہلا کہتا کہتا رک گیا۔ ساتھ ہی اس نے دوسرے کی طرف دیکھا۔

"جنگو ... جیرا ... اور ..." دوسرے نے اٹک اٹک کر کہا اور جملہ پھر نامکمل چھوڑ دیا۔

"جیجا ہیں۔" تیسرے نے مسکرا کر جملہ مکمل کیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ یہ جملہ ادا کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔" خالد محمود تلملا کر بولے۔

"اس لیے کہ ہم تینوں۔"

"تین نہیں ..."

"ایک ہیں۔"

تینوں نے جلدی جلدی کہا اور خالد محمود انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ یہ تینوں ان کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ آخر انہوں نے کہا:

"خدا کے لیے ایک آدمی بات کرو۔ آخر تم کیا چاہتے ہو۔"

"اگر آپ درخواست نہ کرتے تو ہم تینوں ہی باتیں کرتے، خیر! آپ کو یہ پسند نہیں تو صرف میں ... یعنی جنگو بات کروں گا۔ بات

صرف اتنی ہے کہ ہم ڈاکو ہیں اور آپ کو لوٹنے آئے ہیں۔ کیا آپ لٹنے کے لیے تیار ہیں۔" اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے کھیلنے کودنے کے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" خالد محمود نے تقریباً چلا کر کہا:

"یہ بکواس نہیں ہے۔ اور یہ بھی خیال نہ کریں کہ ہمارے ہاتھوں میں جو پستول ہیں، وہ نقلی ہیں ... یہ نہ صرف اصلی ہیں بلکہ ان پر سائیلینسر بھی چڑھے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر ہمیں گولی چلانا پڑی تو اس کی آواز پیدا نہیں ہوگی اور آپ کے پڑوسی آپ کی مدد کو نہیں آئیں گے۔ وہ تو گہری نیند سوتے رہیں گے۔ ٹھہریے۔ آپ کو اس طرح یقین نہیں آئے گا۔ جیرو۔ انہیں یقین دلاؤ۔ میں خود یقین اس لیے نہیں دلاؤں گا کہ خالی فائر کرنا مجھے پسند نہیں۔"

"آتش دان پر جو گل دان رکھا ہے، وہ اگرچہ بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا کیا جائے، خالد محمود صاحب کو اس کا نقصان برداشت کرنا ہی ہوگا، آخر یقین جو دلانا ہوا۔" جیرو کے منہ سے ان الفاظ کے نکلتے ہی ایک ہلکی سی ڈز کی آواز آئی اور پھر ایک چھناکے سے شیشے کا گلدان ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے چاروں طرف اچٹے تھے۔

انہوں نے جھک کر خود کو اس کے ٹکڑوں سے بچایا۔ ساتھ ہی خالد محمود کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

"بدتمیزو۔ میں تمہیں اس کی سزا ضرور دوں گا۔ یہ گل دان میرے

دوست نے لیبیا سے بھیجا تھا۔"

"ہمیں افسوس ہے جناب! جب آپ کا بس چلے، جو جی میں آئے کرتے رہیے گا۔ اچھا اب ہمارا وقت ضائع نہ کیجیے اور چپ چاپ خود کو بندھوا لیجیے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔ ان کے دونوں لڑکے اور بیگم اور ملازم تو تھر تھر کانپنے لگے۔

"جی ہاں! مجبوری ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنا کام کس طرح اطمینان سے کر سکیں گے۔۔۔ آپ کو باندھنا ہی ہوگا۔ آپ پانچوں مہربانی فرما کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔۔۔ ہم یقین دلاتے ہیں۔۔۔ کہ زیادہ سختی سے نہیں باندھیں گے۔"

"سنو۔ گھر میں زیادہ نقدی نہیں ہے۔ زیورات بھی سب بینک کے لاکر میں رکھے ہیں۔ اس لیے تم اپنا وقت بے کار ضائع کر رہے ہو۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں گرفتار کرانے کے لیے پولیس کو فون نہیں کروں گا۔" خالد محمود نے کہا۔

"پولیس۔۔۔ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ہم اسے ضرور دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"عجیب لوگ ہو تم۔" وہ جھلّا اٹھے۔

"ہاں۔ عجیب تو ہیں۔ اب اگر پانچ سیکنڈ کے اندر اندر آپ چاروں دیوار کی طرف منہ کر کے نہ کھڑے ہوئے تو ہم بے دھڑک فائر کر دیں گے۔ اور یہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ جیرو کا نشانہ کتنا

پختہ ہے۔ میرا اور جیجا کا نشانہ بھی برا نہیں ہے۔"

اس مرتبہ جنگو کا لہجہ سرد ہو گیا۔ انہیں اُٹھنے میں ہی بہتری نظر آئی۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ جنگو اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ جیرو اور جیجے نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کمر پر باندھنے شروع کر دیے۔ پھر پیر بھی جکڑ دیے گئے۔ آخر میں اُن کے منہ میں رومال ٹھونس کر اوپر سے کپڑے باندھ دیے گئے۔ اب وہ حلق سے آواز تک نہیں نکال سکتے تھے اور نہ ہی ہل جل سکتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ تینوں گھر کے اندر گھس گئے اور جاتے جاتے اس کمرے کے دروازے بند کر گئے۔ اب وہ کمرے میں قید بھی ہو کر رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تقریباً آدھ گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور جنگو اندر داخل ہوا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

"ہمیں بہت افسوس ہے جناب۔ آپ کو آدھ گھنٹے تک تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ ہم آپ لوگوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر بھی جا سکتے تھے، لیکن اس صورت میں آپ کو صبح تک بندھے رہنا پڑتا، لیکن ہم اتنے بے رحم نہیں ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے ملازم کے ہاتھوں کی رسی کو ڈھیلا کرتے جائیں گے تاکہ ہمارے جانے کے کوئی پندرہ منٹ بعد رسی کھولنے میں کامیاب ہو جائے اور آپ لوگوں

کو بھی ان رسیوں سے نجات دلا دے۔ باقی رہا یہ سوال کہ ہم کیا کچھ
لے جا رہے ہیں، آپ آزاد ہونے کے بعد اندازہ لگا ہی لیں گے۔"
یہ کہنے کے بعد جنگو نے خالد محمود کے ملازم کی رسیاں ڈھیلی
کر دیں اور کمرے سے نکل گیا۔ پھر انہوں نے ان تینوں کے جاتے
ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ دوسری طرف ملازم جلد از جلد رسیوں سے
آزاد ہونے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ لیکن اس کوشش میں وہ دس
منٹ سے پہلے کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر خدا خدا کر کے اس کے ہاتھ
آزاد ہوئے۔ اس نے پیروں کی رسیاں کھولیں اور پھر باری باری انہیں
کھولا۔ خالد محمود آزاد ہوتے ہی اندر کی طرف دوڑے۔ سب سے
پہلے انہوں نے پولیس کو فون کرنا مناسب جانا۔ فون کرنے کے بعد وہ
تجوری اور الماریوں کا جائزہ لینے کے لیے مڑے ہی تھے کہ ان کے
دونوں لڑکے اور بیگم بھی وہاں آ پہنچے۔

"اُف خدا۔ یہاں تو تمام الماریاں اور تجوری کھلی پڑی ہیں۔"
بیگم کے منہ سے نکلا:

"ہاں معلوم ہوتا ہے ... ہم لٹ گئے۔"

"دیکھیے تو سہی ... وہ کیا کچھ لے گئے ہیں۔" انہوں نے پریشان
ہو کر کہا:

"ابھی نہیں۔ میں پولیس کو فون کر چکا ہوں۔ جب تک پولیس
نہیں آ جاتی، ہم کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ تجوری اور

الماریوں پر ڈاکوؤں کے انگلیوں کے نشانات ضرور ملیں گے اور اگر
ہم نے ہاتھ لگا دیے تو وہ نشانات ضائع ہو جائیں گے۔" خالد محمود
نے جواب دیا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" ان کی بیگم نے کہا اور پھر وہ پولیس
کا انتظار کرنے لگے۔ آخر پولیس گھر میں داخل ہوئی۔ سب انسپکٹر کو
ساری بات تفصیل سے سنائی گئی۔ ڈاکوؤں کے نام سن کر وہ حیران
سا ہوا۔

"کمال ہے۔ تین ڈاکوؤں کے اس گروپ کا ذکر پہلے تو کبھی سننے
میں نہیں آیا اور نہ ہی یہ تینوں نام الگ الگ سننے میں آئے ہیں۔"
اس نے کہا:

"اور مزے کی بات یہ کہ وہ تینوں ایک جملے کو بھی آپس میں
تقسیم کر کے بولتے تھے۔ وہ تو اگر میں نہ روک دیتا تو شاید یہ تمام
جملے اسی طرح سننے پڑتے۔ میرے منع کرنے کے بعد صرف جنگو بات
کرتا رہا۔ دوسروں کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔"

"حیرت ہے۔" "اچھا خیر۔ آپ اپنی چیزوں کا جائزہ لے لیں۔
میں بہت جلد انہیں گرفتار کر لوں گا۔
اور آپ کا مال آپ کو واپس مل کر رہے گا۔" اس نے کہا:

"کیا آپ انگلیوں کے نشانات نہیں اٹھائیں گے۔"

"سب کچھ کریں گے۔ لیکن پہلے آپ یہ تو دیکھیں کہ کیا کیا

کیا ہے ۔"

" تو کیا ہمارے ہاتھ لگانے سے انگلیوں کے نشانات ضائع نہیں ہوں گے ۔" خالد محمود نے حیران ہو کر کہا :

" آپ تجوری اور الماری کے ہینڈلوں کو ہاتھ نہ لگائیں ، باقی ہر چیز کو ہاتھ لگا سکتے ہیں ۔"

" بہت خوب !"

خالد محمود اور ان کی بیگم نے چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا ۔ سب انسپکٹر نے دیکھا ، دونوں کے چہروں پہ حیرت طاری ہونے لگی ۔ رفتہ رفتہ اس حیرت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا ۔ اور پھر خالد محمود سر پکڑ کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے ۔ ان کے منہ سے نکلا :

" اف اللہ ـــــ یہ کیا ہوا ۔"

" معلوم ہوتا ہے ، آپ نے تجوری میں بھی رقم رکھی ہوئی تھی ۔" سب انسپکٹر نے پریشان ہو کر کہا :

" جی نہیں ۔ یہ بات نہیں ہے ۔" انہوں نے کہا :

" تو پھر ـــــ کیا زیورات رکھے ہوئے تھے ۔"

" نہیں ۔ نقدی اور زیورات اتنے زیادہ نہیں رکھے ہوئے تھے . . . میں زیادہ تر رقم اور زیورات بنک میں رکھتا ہوں ۔"

خالد محمود بولے ۔ ان کے لہجے میں ابھی تک بلا کی حیرت تھی ۔

" تو پھر کیا بات ہے ۔؟"

" بہت عجیب بات ہے ۔ مجھے کسی طرح بھی یقین نہیں آ رہا ۔"

" بتائیے تو سہی ۔ شاید میں کچھ مدد کر سکوں ۔" سب انسپکٹر نے انہیں عجیب نظروں سے گھور کر کہا ۔ کیونکہ یہ الجھاؤ دار باتیں اسے پسند نہیں آ رہی تھیں ۔

" بات در اصل یہ ہے کہ ہماری تمام چیزیں موجود ہیں ۔ ڈاکو کچھ بھی نہیں لے گئے ۔"

" کیا !!! سب انسپکٹر کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا :

میری مدد کرو

ہوٹل ذیشان کی تیسری منزل کے کمرہ نمبر ایک سو دس میں اس وقت ان کے چہروں پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ لباس بھی شریفانہ تھے۔ ان کے چہروں پر ایسی مسکراہٹیں تھیں جیسے آج تک کبھی ڈاکا ڈالا ہی نہ ہو۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لمبا چوڑا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ نوجوان نے بیٹھتے ہوئے انہیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا:

"رات کی رپورٹ کیا ہے؟"

"خالد محمود اور اس کے بیوی بچوں کو باندھ لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے پورے مکان کی تلاشی لی، تجوری کھول کر دیکھی، الماریوں کو کھنگالا۔ لیکن وہ چیز ہمیں کہیں بھی نہیں ملی۔ آخر ہم وہاں سے لوٹ آئے۔"

"بہت خوب۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی کو نقصان پہنچائے بغیر یا خود کوئی نقصان اٹھائے بغیر واپس آنے میں کامیاب

ہو گئے اور یہی تمہاری کامیابی ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ کامیابی ضرور ضرور ہمارے قدم چومے گی۔"

"آج کے اخبار میں بھی ہمارے متعلق آچکا ہے۔" جگنو نے کہا:

"ہاں! میں پڑھ چکا ہوں۔ خالد محمود نے پولیس کو طلب کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اخبار والوں کو بھی خبر ضرور ملنی تھی۔۔۔"

"اخبار اور پولیس والے اس بات پر سخت حیران ہیں کہ اتنا کامیاب ڈاکا ڈالنے والے نقدی اور زیورات جوں کے توں کیوں چھوڑ گئے۔"

"ہاں۔ انہیں حیران ہونے دو۔ ہمیں اپنا کام جاری رکھنا ہے۔۔۔ انہیں کیا معلوم۔۔۔ ہمیں کس چیز کی تلاش تھی۔" نوجوان عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"آخر وہ ہے کیا چیز۔ ہمیں بھی تو بتائیے۔"

"ابھی نہیں۔۔۔ جس دن تم وہ چیز تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دن تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" نوجوان بولا:

"اس دن تو ہم خود ہی اسے دیکھ لیں گے۔" جیرو نے کہا۔

"تم اسے دیکھ کر بھی یہ نہ جان سکو گے کہ دراصل یہ کیا چیز ہے۔"

"حیرت ہے۔" جیجا کے منہ سے نکلا۔

"اچھا۔ اب چھوڑو۔۔۔ اس بات کو۔ آج رات تمہیں خاور جمیل کے گھر ڈالنا ہے۔ اس کا پتا اور دوسری معلومات میں نے

اس کاغذ پر لکھ دی ہیں۔ انہیں غور سے پڑھ لینا۔ تمہیں اندر داخل ہونے کا طریقہ معلوم ہو جائے گا اور واردات کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔ بہت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق ہی کام ہوگا۔"

"بہت خوب۔ تم تینوں بہت اچھے جا رہے ہو۔ بہت بعد تمہیں شاندار انعام سے نوازا جائے گا۔"

"شکریہ جناب!" جنگو نے خوش ہو کر کہا:

"اگر تمہیں اس مرتبہ وہ چیز مل جائے تو پھر تم صبح ہونے کا انتظار نہیں کرو گے، مجھے فوراً فون کر دینا۔"

"جی اچھا!"

"اور ہاں! ایک بات کا خیال مجھے ابھی ابھی آیا ہے۔ اس بات کا ذکر میں اس کاغذ میں کرنا بھول گیا۔ خاور جمیل کے ملازم سے ہوشیار رہنا۔ وہ کوئی عام سا ملازم نہیں ہے، ایک ریٹائرڈ فوجی ہے اور خاور جمیل کے لیے اپنی جان تک خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ میں نے اس لیے تمہیں بتا دیا کہ تم اس کی طرف سے لاپروا نہ ہو جاؤ۔ اور تم پر حملہ نہ کر بیٹھے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا کہ بتا دیا۔ ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم ملازموں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔"

"یہ بات تو غلط ہے۔ بعض ملازم اپنے مالکان کے لیے جان تک دے دیتے ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ ان وارداتوں میں خون کا ایک قطرہ بھی بہے۔"

"ہم اس کا خیال رکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ کل اسی وقت اسی کمرے میں ملاقات ہوگی۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تینوں بھی اُٹھے اور پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ تینوں اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کرسیوں پر بیٹھے اور کاغذ کھول کر میز پر رکھتے ہوئے تینوں اس پر جھک گئے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

"یار رات جو شہر میں واردات ہوئی ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔" آصف کہہ رہا تھا۔

"اچھا... میرا تو خیال تھا کہ تم سمجھ گئے ہوگے۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"تو کیا تم سمجھ گئے ہو۔" آصف بھی حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"نہیں تو۔ میں بھی نہیں سمجھ سکا۔" اس نے مایوسانہ انداز میں شانے اچکائے۔

"تو پھر کیوں کان کھا رہے ہو۔" آصف نے بُرا سا منہ بنایا۔

"بھوک لگی ہوئی ہے۔" آفتاب شوخ انداز میں مسکرایا۔

"تو چلو۔ اب گھر چلیں۔ تمہاری بھوک کا بندوبست تو گھر میں ہی ہو سکتا ہے۔" آصف جھلّا اُٹھا۔

"ہاں! تمہارے یہ دو چھوٹے چھوٹے کان تو ناکافی رہیں گے۔"

"ایک بات کے پیچھے نہ پڑ جایا کرو۔" آصف نے تلملا کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ اب میں ایک سے زیادہ باتوں کے پیچھے پڑا کروں گا۔ مگر یار... یہ باتوں کے پیچھے پڑنے والا محاورہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"تمہاری سمجھ میں کوئی محاورہ آیا ہی کب ہے کہ یہ آئے گا۔" آصف بولا۔

"اچھا بھائی جھنجھلاہٹ کے انگارے نہ چباؤ۔ منہ جھلس جائے گا۔"

ہمدردی کا شکریہ۔" ہم بات کر رہے تھے ان تینوں کی اور پہنچ گئے کہاں۔" آصف نے اکتا کر کہا۔

"کن تینوں کی۔ اور ہم کہاں پہنچ گئے۔ سیر کرتے ہوئے اس سڑک پر تو چلے جا رہے ہیں جس سڑک پر روزانہ سیر کرتے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے، آج تم نے سنجیدہ نہ ہونے کی قسم کھالی ہے:"

"ابھی تک تو کھائی نہیں، تم کہو تو کھا لیتا ہوں۔" آفتاب مسکرایا۔

"میں کہتا ہوں، جب کچھ چُرانا نہیں تھا تو ڈاکا ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" آصف بولا۔

"ارے ارے میں نے کب کہیں ڈاکا ڈالا ہے۔" آفتاب گھبرا گیا۔

"میں تمہاری بات نہیں کر رہا۔ ان تینوں کی بات کر رہا ہوں، جنھوں نے رات خالد محمود صاحب کے گھر میں واردات کی ہے۔ صبح اخبار میں پوری تفصیل آئی تو ہے۔"

"ہاں میں پڑھ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تینوں بدمعاش بہت ہی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" آصف نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں۔ کیا ایسا ہونا ناممکن ہے۔" آفتاب بولا:

"یار کبھی تو کوئی ڈھنگ کی بات کر لیا کرو۔"

"اس کام کے لیے تم جو موجود ہو۔" آفتاب مسکرایا۔

"کیا تم نے نہیں سوچا... آخر انھوں نے واردات کیوں کی... انھوں نے سارا کام پورے اطمینان سے کیا... کسی قسم کا کوئی خطرہ یا ڈر نہیں تھا... تجوری اور الماریاں تک کھولنے میں وہ کامیاب ہو گئے تھے... پھر... نقدی... زیورات اور دوسرا قیمتی سامان کیوں جوں کا توں چھوڑ گئے۔"

"ان سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" آفتاب بولا:

"میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے... اور اسی لیے میں برابر

ان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ تمھاری سمجھ میں دو باتیں آئی ہیں۔ ایک بھی غنیمت ہے۔ خیر... اب وہ بات بتا ہی دو۔ کہیں میں الجھن کا شکار نہ ہو جاؤں۔"

"تم اور الجھن... ناممکن۔ تم وہ ہو... جو کبھی الجھتا ہی نہیں، لاکھ الجھاؤ۔" آصف نے جھلا کر کہا:

"چلو مان لیا۔ اب بتاؤ۔ تمھاری سمجھ میں کیا بات آتی ہے۔"

"یہ کہ... وہ تینوں ضرور کسی خاص چیز کی تلاش میں تھے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے تم... یہ بات تو میں صبح ہی سمجھ گیا تھا۔"

"تو پھر تم نے ذکر کیوں نہیں کیا۔" آصف نے تلملا کر کہا:

"اس خیال سے کہ کہیں تمھارا دل نہ ٹوٹ جائے۔ یہ سوچ کر کہ میں نے تم سے پہلے اس بات کو بھانپ لیا ہے۔" آفتاب برابر مسکرائے جا رہا تھا۔

"میرا دل اتنا کمزور نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔"

"بلکہ ایک سوال یہ بھی ہے کہ وہ تینوں وہ چیز لے گئے۔" آفتاب بولا۔

"ہاں۔ یہ بھی بہت اہم سوال ہے۔ لیکن ان دونوں سوالوں کا جواب تو ہمیں ان تینوں سے ہی مل سکتا ہے۔" آصف نے سوچ میں

ڈوبتے ہوئے کہا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے وہ تمھیں بتا ہی تو دیں گے۔" آفتاب بولا۔

"اگر وہ تینوں مجھے مل گئے تو میں ان سے پوچھ کر دکھا دوں گا۔"

"سامنے سے کار آ رہی ہے... سڑک سے نیچے اُتر آؤ۔" آفتاب نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں سڑک سے نیچے اُتر آئے۔ اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ کار کی رفتار کم ہو گئی ہے۔ پھر وہ ان کے قریب رُک گئی۔

"ہیلو... آفتاب... آصف۔" ایک لڑکے کی کھنک دار آواز سنائی دی۔ اُنھوں نے چونک کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ ان کا دوست ماجد بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی سگار منہ سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں پہ نظر کی عینک تھی۔

"ہیلو ماجد۔ کہاں سے آ رہے ہو۔" انھوں نے اس سے ہاتھ ملائے۔

"ایک رشتے دار سے ملنے گئے تھے۔ یہ میرے والد خاور جمیل ہیں۔"

"السلام علیکم انکل۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"وعلیکم السلام۔" انھوں نے شفقت سے بھرپور لہجے میں کہا، پھر ان دونوں سے ہاتھ ملائے۔

"شہر واپس جانا ہے تو آجاؤ۔" ماجد نے کہا۔

"ہم تو گھر سے سیر کرنے نکلے ہیں، سیر کرتے ہوئے ہی واپس جائیں گے۔"

"ابو۔۔۔ یہ کامران مرزا صاحب کے بیٹے ہیں۔"

"ارے ۔ کیا واقعی۔" خاور جمیل کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"جی ہاں ۔۔۔ یہ وہی دونوں ہیں۔"

"اوہ! پھر تو بہت ہی خوشی ہوئی تم دونوں سے مل کر۔" انھوں نے ایک بار پھر ان سے ہاتھ ملایا۔ اس بار ان کے انداز میں اور بھی گرم جوشی تھی۔ اچانک ان کا رنگ اڑ گیا۔ چہرے پر گھبراہٹ کے آثار طاری ہو گئے۔

آفتاب اور آصف نے ان کی بدلتی ہوئی حالت کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ماجد بھی حیران حیران نظر آ رہا تھا۔ پھر دفعتہً ان کے لب ہلے:

"میرے بیٹو۔ میری مدد کرو۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔"

ڈکی میں

دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔ کئی سیکنڈ تک وہ انہیں دیکھتے رہے۔ آخر آصف نے کہا:

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کیا تم آج کی سیر ختم کر کے ہمارے ساتھ کار میں نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم تمہیں تمہارے گھر کے پاس اتار دیں گے۔ کار میں میں کچھ تفصیل بتاؤں گا۔" خاور جمیل بولے۔

"بہت اچھا انکل۔" آفتاب نے کہا:

اور وہ دونوں بھی پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹ پر صرف ڈرائیور بیٹھا تھا۔

"چلو ڈرائیور!" خاور جمیل نے کہا اور ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

آصف اور آفتاب نے بیک ویو آئینے میں دیکھا، وہ ایک نوجوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا۔ گاڑی کے چلتے ہی آفتاب نے کہا:

"ہاں! اب فرمائیے۔ آپ کو ہماری مدد کس سلسلے میں

درکار ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں۔ تمہیں کس طرح بتاؤں۔ یہ کہانی کہاں سے شروع کروں۔"

"شروع سے شروع کر دیں۔" آصف مسکرایا۔

"ہاں! مجھے یہی کرنا ہوگا... جب تک میں پوری تفصیل سے بات نہ بتاؤں گا، تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یہ آج سے چھ ماہ پہلے کی بات ہے... ایک رات جب کہ ماجد اور ماجد کی امی اپنے نانکے گئے ہوئے تھے اور میں گھر میں اکیلا تھا، دروازے پر دستک ہوئی، میں نے ملازم کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور خود اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے دیکھا، دروازے میں ایک شریف صورت انسان کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی، اس نے بڑی نرم آواز میں کہا کہ وہ اس شہر میں پردیسی ہے۔ اور ایک رات کے لیے مہمان رہنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے گھر کا دروازہ فوراً اس کے لیے کھول دیا۔ مہمان خانے میں اسے پہنچایا۔ کچھ کھانے پینے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنا نام ظہیرالدین خان بتایا تھا۔ دوسرے دن میں نے اسے ناشتا کرایا۔ پھر وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد جب میں مہمان خانے میں داخل ہوا تو دھک سے رہ گیا۔ کمرے میں اس کا تھیلا پڑا تھا۔ میں سمجھا، وہ اپنا تھیلا بھول گیا ہے، چنانچہ

اس نے اسے کھول کر بھی نہ دیکھا اور اسی طرح ایک الماری میں بند کر کے رکھ دیا۔ دن گزرتے گئے، گزرتے گئے لیکن وہ اپنا تھیلا لینے واپس نہ آیا۔ ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی اس تھیلے میں ہے کیا۔ اور پھر میں نے تھیلا کھول ڈالا۔"

یہاں تک کہہ کر خاور جمیل خاموش ہو گئے۔ آصف، آفتاب اور ماجد اس کہانی کو پوری محویت سے سن رہے تھے۔ ان کے خاموش ہو جانے پر چونک اُٹھے۔ آفتاب نے فوراً پوچھا۔

"اس میں کیا تھا انکل۔"

"ہاں، اب میں تمہیں یہی بتانے جا رہا ہوں کہ اس میں کیا تھا۔ تھیلے کے اندر دیکھتے ہی میری سٹی گم ہوگئی اور ہوش اُڑ گئے۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ تینوں نے بے چینی کے عالم میں پہلو بدلا اور آصف نے کہا۔

"بتایئے۔ آپ رک کیوں گئے۔"

"ہاں۔ میں بتاتا ہوں۔ اس تھیلے میں کارتوس تھے... صرف خالی کارتوس۔" انہوں نے کہا:

"رائفلوں کے کارتوس۔" تھیلا منہ تک بھرا ہوا تھا۔"

"اوہ!!!" ان کے منہ سے نکلا۔ ان کے چہروں سے گہری حیرت کے آثار ظاہر تھے۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" آفتاب نے کہا:

"میری سمجھ میں بھی نہیں آئی - میں خود بہت حیران ہوں کہ آخر اس تھیلے میں ان کارتوسوں کا کیا کام تھا۔ وہ شخص انہیں کہاں لیے پھر رہا تھا۔"

"اچھا خیر - آگے چلیے۔"

"ایک ماہ بعد مجھے ایک خط موصول ہوا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ان کارتوسوں کو حفاظت سے رکھوں، میں کسی وقت بھی آ کر لے سکتا ہوں۔ اگر کارتوسوں کے بارے میں کسی کو بتایا تو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ نیچے ظہیرالدین خان لکھا ہوا تھا۔ مجھے یاد آگیا، اس عجیب مہمان نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔ ایک ماہ بعد پھر اس کا خط ملا۔ اس مرتبہ اس نے لکھا تھا کہ تھیلا اپنے مکان میں کسی جگہ چھپا دو۔ اگر ان کارتوسوں پر کسی کی نظر پڑ گئی تو بہت خطرناک بات ہوگی، میں ابھی تھیلا وصول کرنے نہیں آ سکتا، جب بھی موقع ملا، میں ضرور پہنچوں گا... اور اس خط کے بعد کوئی خط آیا نہ وہ خود آیا۔ تھیلا میں نے ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ اب پورے چھ ماہ گزر گئے ہیں... میں آج تک سمجھ نہیں سکا کہ آخر وہ کیا بلا ہیں۔ رائفلوں کے کارتوس تو عام چیز ہیں۔ تھیلا اب تک میرے گھر میں موجود ہے اور میرا ذہن ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اپنے کسی ہمدرد کو یہ ساری بات بتا دوں، لیکن ہمت نہ کر سکا۔ آج اچانک تم سے ملاقات ہوئی تو دل

کی بات زبان پر آگئی۔

ان کے خاموش ہونے پر چند سیکنڈ تک خاموشی چھائی رہی۔ آخر آفتاب نے کہا۔

"کیا آپ ہمیں وہ کارتوس دکھا سکتے ہیں؟"

"ہاں ضرور - اگر تم دونوں آج میرے گھر آ جاؤ تو میں تمہیں وہ تھیلا دکھا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے انکل... اس وقت تو ہم گھر جائیں گے۔ شام کو ابا جان سے اجازت لے کر آپ کے ہاں آ جائیں گے، ویسے آپ پسند کریں تو ہم انہیں بھی ساری بات بتا دیں۔"

"نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے کانوں میں بھنک پڑ جائے، نہ جانے وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ ہم آ جائیں گے۔" "آپ بے فکر رہیں۔" آفتاب نے کہا۔

ان کا گھر نزدیک آ گیا تھا۔ انہوں نے کار سڑک کے کنارے رکوائی اور دونوں نیچے اتر آئے۔ کار جونہی آگے بڑھی دونوں کی نظریں ڈکی پر پڑی۔ ڈکی کا دروازہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا اور اس میں سے انسانی چہرہ جھانک رہا تھا۔

نکل گیا

وہ دھک سے رہ گئے۔ کار لمحہ بہ لمحہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ آناً فاناً میں یہ کیا حالات پیش آ گئے تھے۔ وہ تو گھر سے سیر کرنے نکلے تھے۔ راستے میں ان کا دوست اور دوست کے والد کار میں آتے نظر آئے تھے۔ کار ان کے قریب رُک گئی تھی۔ خاور جمیل نے ان سے کار میں بیٹھ کر ان کی بات سننے کی درخواست کی تھی۔ وہ کار میں بیٹھ گئے تھے۔ شہر کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے کارتوسوں کے تھیلے کی وہ عجیب و غریب کہانی سُنی تھی۔ پھر گھر کے نزدیک وہ نیچے اترے اور جب کار آگے بڑھی تو انہوں نے دیکھا۔۔۔ کار کی ڈکی میں کوئی آدمی موجود تھا۔ چند لمحے تک وہ سکتے کے عالم میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

"آصف۔ اب کیا کریں۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا:

"ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، یا تو گھر چلیں اور یا کسی رکشے یا ٹیکسی میں بیٹھ کر ماجد کے گھر جا پہنچیں، نہ جانے ڈکی میں کون شخص چھپا ہوا تھا۔" آصف بولا:

"کیوں نہ ہم گھر چل کر ابّا جان کو ساری بات بتا دیں، گھر تو چند قدم کے فاصلے پہ ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ کامران مرزا صحن میں بیٹھے شہناز بیگم سے باتیں کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر چونک اُٹھے:

"خیر تو ہے۔ آج تم جلدی آ گئے۔"

"ابّا جان۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ میں جلد از جلد آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے خاور جمیل کے ملنے اور ان کی کار میں وہاں تک آنے کے بارے میں جلدی جلدی بتایا اور پھر بولا:

"اب بتائیے۔ ہم کیا کریں۔"

"آرام۔" انہوں نے خلافِ توقع مسکرا کر کہا۔ دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یہ کہانی سُن کر ضرور اچھل پڑیں گے اور ان کے ساتھ ماجد کے گھر روانہ ہو جائیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کامران مرزا نہ چونکے نہ اُٹھے بلکہ ان کے چہرے پر تو حیرت کے آثار بھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور یہی بات ان دونوں کو حیران کیے دے رہی تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔

"انکل۔ ہم حیران ہیں۔ آپ یہ کہانی سُن کر حیران نہیں ہوئے۔"

"میرے لیے اس میں حیران ہونے کی کوئی بات ہے ہی نہیں۔"
انھوں نے کہا:

"آخر کیسے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ جانتے ہیں؟"
آفتاب نے پوچھا۔

"نہیں... لیکن میں حالات اور واقعات سُن کر اندازہ ضرور لگا لیا کرتا ہوں۔ اچھا خیر۔ تم یوں کرو کہ کسی رکشے میں بیٹھ کر خاور جمیل کے ہاں چلے جاؤ۔"

"ہم وہاں جا کر کریں گے کیا؟"

"حالات کا سامنا۔ بس... اب اور کچھ نہ پوچھنا۔ اتنی اجازت بھی اس لیے دے رہا ہوں کہ ماجد تمہارا دوست ہے۔ اچھا اب جاؤ۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔ پھر میں جب مناسب سمجھوں گا، فون پہ ہدایت دے دوں گا۔"

"جی اچھا۔" حیران پریشان سے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انسپکٹر کامران مرزا انہیں ایک عجیب آدمی نظر آ رہے تھے۔

گھر سے نکلتے ہی انہیں رکشے کی صورت نظر آ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ ماجد کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اُنھوں نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بے دھڑک اندر گھس گئے۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ کمروں میں بلب روشن ہو گئے تھے۔ ایک کمرے میں انہیں ہل چل سی محسوس ہوئی۔

...اچانک ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تم اب میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے خاور جمیل۔"

وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھے۔ دروازہ تھوڑا سا کُھلا تھا اور اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا، خاور جمیل، ماجد اور ان کا ڈرائیور ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک شخص پستول اُٹھائے کھڑا تھا۔ اس آدمی کی کمر ان کی طرف تھی۔ وہ ان سے بے خبر تھا۔

دونوں دبے پاؤں اندر کی طرف بڑھنے لگے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

"سُنو۔ دیکھو... اپنا پستول جیب میں رکھ لو۔ میں نے کچھ نہیں کہا، تمہارا تھیلا اب تک جوں کا توں پڑا ہے۔ تم بڑی خوشی سے لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" خاور جمیل کہہ رہے تھے۔

"غلط کہتے ہو۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے، تم نے تھیلے کے بارے میں دوسروں کو بتا دیا ہے۔ اب میں تمہیں کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے بتایا ہے؟"

"آج... ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ جب تم کار میں اپنے بیٹے کے ساتھ آ رہے تھے، کیا اس وقت تم نے دو لڑکوں کو کار میں

نہیں بٹھایا تھا۔ اور انہیں تھیلے کی کہانی نہیں سنائی تھی۔"

"کیا... مم... مگر... تم... اس وقت کہاں تھے۔" خاور جمیل نے بُری طرح ہکلا کر کہا۔ ان کا رنگ اڑ گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگے تھے۔

"میں اس وقت تمہاری کار کی ڈکی میں تھا۔ تمہاری کار کے اندر ایک آلہ لگا ہوا تھا اور اس آلے کے ذریعے میں ڈکی کے اندر دبکا ہوا تمہاری باتیں بخوبی سُن رہا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ میں بے خبر اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں تو تمہاری نہ جانے کتنے دنوں سے نگرانی کر رہا ہوں۔ سائے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ رہا ہوں۔ تم نے بد عہدی کی ہے اور بد عہدی کی سزا میرے نزدیک موت ہے۔"

"کیا میرے احسان کا بدلہ یہی ہے۔ میں نے تمہیں ایک رات اپنے گھر میں ٹھہرایا اور پھر تمہارے تھیلے کی سال بھر حفاظت کرتا رہا۔ اس کا صلہ تم یہ دے رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر!" خاور جمیل نے جھنجھلا کر کہا۔

"اگر تم نے یہ راز کسی کو نہ بتایا ہوتا تو آج بہت فائدے میں رہتے۔" وہ ہنسا۔

"آخر تم کون ہو اور یہ کارتوس کیسے ہیں؟"

"تمہارے ان دونوں سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔

ویسے تم مجھے مہمان کہہ کر بلا سکتے ہو۔"

"اچھے مہمان ہو۔ میزبان کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو۔"

"تم نے بھی تو امانت کی پوری طرح حفاظت نہیں کی۔"

یہ کہہ کر پستول والے نے ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھایا ہی تھا کہ آصف اور آفتاب ایک ساتھ اس کی کمر سے ٹکرائے اور وہ اوندھے منہ گرا۔ آصف اور آفتاب بھی گرتے گرتے بچے تھے۔ پستول حملہ آور کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر دُور تک گھسٹتا چلا گیا تھا۔ آصف نے جھپٹ کر اُسے اٹھا لیا۔

"اوہ... اوہ... میرے بچو... تم نے کمال کر دیا۔ مم... مگر... تم... تم یہاں تک کس طرح پہنچ گئے۔ تمہیں تو یہاں رات کو آنا تھا۔" خاور جمیل نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ان دونوں کی طرف بڑھے اور ان سے چمٹ گئے۔

"ارے ارے انکل۔ وہ۔ نکل جائے گا۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"کون نکل جائے گا۔" خاور جمیل نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ... یہ... ارے... وہ تو نکل بھی گیا۔" آفتاب ہکا بکا رہ گیا۔

حملہ آور عین اس وقت جب خاور جمیل خوشی سے دیوانے ہو کر انہیں چمٹانے کے لیے آگے بڑھے، کمرے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ کھڑے ہاتھ مل رہے تھے۔

شمشاد خان

"مجھے بے حد افسوس ہے..... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" خاور جمیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"کوئی بات نہیں انکل۔ جو ہوا اچھا ہوا، آپ کی جان بچ گئی۔ یہی بہت ہے۔" آفتاب بولا:

"آفتاب آصف، میں تم دونوں کا شکر گزار ہوں۔ دوست ہو تو تم جیسا۔" ماجد کے منہ سے نکلا:

"میں بھی یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم یکایک یہاں کس طرح پہنچ گئے۔"

"آپ نے جب ہمیں کار سے اُتارا اور کار آگے بڑھی تو اس وقت ہم نے دیکھا... کار کی ڈکی کا دروازہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا اور اس میں سے ایک آدمی کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ بس ہم گھبرا گئے اور ایک رکشے میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گئے۔" آفتاب نے بتایا۔ اس نے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ دونوں ساری کہانی کامران مرزا کو بھی بتا آئے ہیں۔

"خیر... جان بچ جانے کی خوشی میں ہی تمہیں اور انسپکٹر کامران مرزا کو دعوت تو پھر کسی دن دوں گا، اس دن اور بہت سے دوستوں کو بھی بلاؤں گا... لیکن آج شام کا کھانا بھی تمہیں میرے ساتھ کھانا ہوگا۔"

"ابا جان اور امی جان ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" آفتاب نے کہا۔

"ارے ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا۔ اس وقت تک تو تم دونوں کو سیر کے بعد گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ ضرور پریشان ہوں گے۔ تم یوں کرو کہ انہیں فون کر دو۔ بتا دینا کہ راستے میں ہم مل گئے تھے اور ہمارے ساتھ تمہیں یہاں آنا پڑ گیا۔"

"جی اچھا۔ فون کہاں ہے۔" آفتاب نے پوچھا۔

"ماجد۔ انہیں فون والے کمرے میں لے جاؤ۔"

ماجد انہیں وہاں لایا۔ آفتاب نے گھر کے نمبر ڈائیل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا۔

"یہ انسپکٹر کامران مرزا کا گھر ہے۔ میں ان کی بیگم بول رہی ہوں۔"

"امی جان۔ یہ میں ہوں آفتاب۔"

"اوہ بیٹے آفتاب۔ کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔"

"ابا جان کو فون دے دیں۔ مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔"

"لیکن وہ تو گھر نہیں ہیں۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد وہ گھر سے چلے گئے تھے۔"

"اوہ - خیر - وہ آئیں تو انہیں بتا دیں کہ ہم آج رات کا کھانا اپنے دوست ماجد کے گھر کھائیں گے - اُنہوں نے ہمیں روک لیا ہے سیر کے دوران یہ لوگ راستے میں مل گئے تھے " آفتاب نے گول مول انداز میں کہا :

"اچھی بات ہے - میں سمجھ گئی - تمہارے ابّا جان آئیں گے تو بتا دوں گی "

"بہت بہت شکریہ امی جان ؟" آفتاب نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا -

وہ واپس آئے تو کمرے کی فضا پر سکون ہو چکی تھی - خاور جمیل ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کا ڈرائیور جا چکا تھا - باورچی کو تو شاید اس ہنگامے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی - وہ باورچی خانے میں ہی مصروف رہا تھا - وہ تینوں اندر داخل ہوئے تو خاور جمیل نے کہا :

"کھانا جلد ہی تیار ہو جائے گا - تم دونوں کو یہاں زیادہ دیر رُکنا نہیں پڑے گا "

"کوئی بات نہیں انکل - ہم فون کر ہی آئے ہیں - اب اگر یہاں کچھ دیر بھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں - اب آپ ہمیں کارتوسوں کا وہ تھیلا دکھا دیں "

"اچھی بات ہے - آؤ میرے ساتھ "

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے - ان کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک اور کمرے میں داخل ہوئے - اس کمرے کی سامنے والی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا - خاور جمیل نے اس دروازے میں لٹکا ہوا بڑا سا تالا کھولا اور وہ اندر داخل ہوئے - یہ ایک کباڑ خانہ تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی اور پرانی چیزوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا - خاور جمیل نے اس انبار کو ایک نظر دیکھا اور پھر ایک جگہ سے چیزیں اِدھر اُدھر ہٹانے لگے - اور پھر ان کے ہاتھوں کی حرکت میں تیزی آگئی - چہرے پر پریشانی کے آثار صاف دکھائی دینے لگے -

"کیا بات ہے انکل - خیر تو ہے "

"وہ ... وہ ... تھیلا ... یہیں تھا - میں نے اسی جگہ چھپایا تھا " انہوں نے بوکھلا کر کہا :

"اوہ - ذرا اچھی طرح اطمینان کر لیجیے - ہو سکتا ہے ... آپ نے کسی اور طرف رکھ دیا ہو " آفتاب بولا :

"ہوں - میں دیکھتا ہوں "

پندرہ منٹ تک چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد یہ بات صاف ہو گئی کہ کارتوسوں کا تھیلا کباڑ خانے میں کہیں نہیں تھا -

* * * * * *

انسپکٹر کامران مرزا آفتاب اور آصف کے گھر جانے کے بعد مُسکراتے ہوئے اُٹھے - اُنہوں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور

گھر سے باہر نکل آئے۔ چند سیکنڈ بعد ان کی موٹر سائیکل سڑک پر اڑی جا رہی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد انہوں نے ایک جگہ موٹر سائیکل روک لی اور اس پر سے اُتر آئے۔ اب وہ فٹ پاتھ پر ٹہل رہے تھے۔ ان کی نظریں بار بار ایک مکان کے دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ آخر اس مکان کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اسے نکلتے دیکھ کر وہ جلدی سے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا وہ شخص بھی مکان کے پاس کھڑی موٹر سائیکل پر بیٹھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ان کی موٹر سائیکل اس آدمی کی موٹر سائیکل کا تعاقب کر رہی تھی، لیکن درمیان میں اتنا فاصلہ تھا کہ تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے درمیانی فاصلہ بھی برقرار رکھا اور اس موٹر سائیکل کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

یہ تعاقب آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔ آخر اگلی موٹر سائیکل ایک بڑی سی عمارت کے سامنے رُک گئی۔ موٹر سائیکل کا انجن بند کر کے وہ آدمی اس عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے بھی اپنی موٹر سائیکل پہلی کے برابر میں کھڑی کی اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اب وہ آدمی انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر منزل پر آنے والے کمرے میں جھانکتے ہوئے وہ تیسری منزل پر پہنچے۔ دائیں طرف انہیں ایک سُرخ رنگ کا دروازہ نظر آیا۔

کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ انہوں نے دیکھا موٹر سائیکل والا اس کمرے میں موجود تھا اور فون پر جھکا کسی کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ وہ دم سادھے کھڑے رہے۔ آخر فون کا سلسلہ مل گیا اور اس آدمی نے کہا:

"ہیلو... میں... شمشاد خان بول رہا ہوں۔ میں اپنا کام کر آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ پھر بولا:

"جی نہیں... میرا کسی نے تعاقب نہیں کیا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر دوسری طرف کی بات سُنی اور بولا:

"جی جی... ہاں۔ مجھے یقین ہے... کسی نے میرا پیچھا نہیں کیا۔"

"ٹھہرو دوست۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پرسکون آواز میں کہا۔ شمشاد خان چونک کر مڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف کے مارے پھیلتی چلی گئیں۔ انسپکٹر کامران مرزا پستول ہاتھ میں لئے اس کے سر پر کھڑے تھے اور اس کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے موت کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔

"ریسیور مجھے دے دو۔ اس کے باقی سوالات کے جواب میں خود دوں گا۔" انہوں نے مسکرا کر دھیمے لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے بار بار ہیلو ہیلو کہا جاتا رہا تھا۔ پھر جھنجھلا کر کہا گیا:

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔"

"ہاں۔ سانپ ہی سونگھ گیا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے

مسکرا کر کہا:

"کیا مطلب ... ارے ... یہ آواز ... کون ہو تم ..."

"خاکسار کو انسپکٹر کامران مرزا کہتے ہیں۔ شمشاد خان نے غلط کہا ہے۔ اس کا تعاقب میں نے کیا ہے اور فون والے کمرے تک کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت فون پر تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم شمشاد خان سے جو کچھ معلوم کرنا چاہتا ہو۔ مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔"

"تم نے شمشاد خان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔" دوسری طرف سے غرّا کر کہا گیا۔

"میں نے تو ابھی اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ بالکل صحیح سلامت ہے، کہیں سے بھی نہیں ٹوٹا پھوٹا۔ ویسے تم اسے ٹوٹی پھوٹی حالت میں دیکھنا پسند کرو گے۔"

"سنو اگر تم بہادر ہو ... جیسا کہ میں نے سنا ہے، تو وہیں ٹھہرنا۔ میں آ رہا ہوں۔"

"ارے۔ کیا مجھ سے کشتی لڑو گے؟"

"اس شمشا خان کے ہاتھوں تمہیں پٹواؤں گا۔"

"بہت خوب ... یہ تو بہت دلچسپ کھیل رہے گا۔ جلد آؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"لیکن اگر تم نے اپنے خاص آدمیوں یا پولیس والوں کو بلایا تو

یہ بات سارے شہر میں مشہور کرا دی جائے گی کہ انسپکٹر کامران مرزا جو بہت دلیر اور بے خوف آدمی مشہور ہے، در اصل اندر سے ایک گیدڑ سے بھی کم ہے۔"

"بے فکر رہو۔ شمشاد خاں اس بات کی گواہی دے گا کہ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔"

"تو پھر میں آ رہا ہوں۔"

"کیا اکیلے آؤ گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے ساتھ چند آدمی ہوں گے۔ لیکن وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ تمہارے لیے تو شمشاد خان ہی کافی ہوگا۔"

"اچھی بات ہے۔ یونہی سہی۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور شمشاد خاں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ پھر بولے:

"لو یار ... مجھے پٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"جی ... کیا مطلب؟"

"تمہارا استاد یہاں آ رہا ہے۔ اس کا پروگرام مجھے تمہارے ہاتھ سے پٹوانے کا ہے۔"

"اوہ ... یہ تو بہت بُرا ہوا۔" شمشاد خان نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا بُرا ہوا۔ مگر نہیں ... پہلے تم یہ بتاؤ۔ تم نے وعدہ خلافی کیوں کی۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ شریفانہ زندگی گزارو گے۔ پچھلی مرتبہ جب تم نے نیشنل بنک میں ڈاکا ڈالا تھا تو

میں سراغ لگاتا ہوا تم تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن تمہاری چھوٹی بہن کی خاطر میں نے تمہاری سزا میں کمی کی سفارش کر دی تھی اور تم جلد رہا کر دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود میں تمہیں آج یہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"میں مجبور ہوں۔ میری بہن اس کی قید میں ہے۔ اگر میں اس کے لیے کام نہ کروں گا تو وہ اسے ختم کر دیں گے۔" اس نے روتے ہوئے بتایا:

"اوہ! تم نے ان حالات کی مجھے خبر کیوں نہیں دی۔"

"وہ ہر وقت میری نگرانی کرتا ہے۔"

"کیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی تمہاری نگرانی ہو رہی ہوگی اور نگرانی کرنے والے نے مجھے بھی دیکھ لیا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ ضرور یہی بات ہے۔ لیکن نگرانی کرنے والا صرف نگرانی کرے گا اور اسے رپورٹ دے گا۔"

"ہوں... مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہاری بہن اس کے قبضے میں کیسے چلی گئی؟"

"جیل سے چھوٹ کر میں محنت مزدوری تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ ایک دن بہن غائب ہوگئی اور اس کے بستر پر ایک خط پڑا ملا۔ اس میں لکھا ہوا تھا۔ تمہاری بہن ہمارے قبضے میں ہے۔ اگر تم نے ہماری ہدایات پر عمل نہ کیا تو ہم اسے جان سے مار دیں گے۔

اس دن سے میں ان لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہوں۔ یہ کمرہ بھی مجھے اس نے دیا ہے۔"

"کیا تم اسے جانتے ہو۔"

"جی نہیں... بس فون پر اس کی آواز پہچانتا ہوں۔"

"آواز تو خیر میں بھی سن چکا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ آواز بدل کر بولتا ہے؟"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اچھا... تم کیا کہہ رہے تھے۔ یہ بہت برا ہوا۔ وہ مجھے تمہارے ہاتھ سے پٹوانا چاہتا ہے۔ تو اس میں بہت برا کیا ہوا۔ کیا تم مجھے پیٹ سکو گے؟"

"جی... جی..."

اسی وقت ایک کرخت آواز سنائی دی۔

"ہاں انسپکٹر، شمشاد خان نہیں پیٹ سکتا ہے۔"

دشمن آ گئے

تھیلا نہ ملنے پر خاور جمیل ہواس باختہ نظر آنے لگے۔ ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

"اُف خدا۔ اب کیا ہوگا۔ وہ تو مجھے جان سے مار دے گا۔"

"کمال ہے۔ آخر تھیلا یہاں سے کہاں جا سکتا ہے۔" آصف نے کہا۔

"کیا کسی اور کو بھی معلوم تھا کہ تھیلا آپ نے یہاں رکھا ہے۔"

"میرے سوا کسے معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے رات کے اندھیرے میں اٹھ کر وہ تھیلا چھپایا تھا۔"

"تو پھر ضرور آپ کا مہمان ہی تھیلا لے اڑا ہے۔ اسے یہ بات تو معلوم ہی تھی کہ تھیلا آپ نے گھر میں ہی کہیں چھپا رکھا ہے اور جو شخص آپ کی ڈکی تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ اس کباڑ خانے تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ وہ ضرور تالے کھولنے کا ماہر بھی ہے۔" آفتاب نے کہا:

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"پھر بھلا وہ آپ کو کیوں مارنے لگا۔ اب اسے اپنا تھیلا تو

مل ہی چکا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تھیلا کوئی اور لے اڑا ہو۔ اس صورت میں وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ہاں اگر ایسا ہوا ہے تو ضرور بات پریشانی والی ہے مگر آپ فکر نہ کریں۔ جب تک وہ گرفتار نہیں ہو جاتا، آپ کی حفاظت کا انتظام کرایا جائے گا۔" آصف نے کہا:

"سوال تو یہ ہے کہ اس تھیلے میں تھا کیا۔" آفتاب بولا:

"کارتوس۔" آصف بولا:

"ہشت۔ صرف کارتوسوں کے لیے اتنا ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کارتوسوں میں ضرور کوئی چیز تھی۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ۔ ان میں کیا چیز تھی۔"

"ان کارتوسوں میں بارود اور گولیاں نہیں ہوں گی۔ ضرور کوئی اور چیز ہوگی۔ کوئی بہت ہی قیمتی چیز۔ یا بہت ہی خطرناک چیز۔" آفتاب نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اوہ۔ شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" آصف نے چونک کر کہا۔

"اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چکر کوئی معمولی چکر نہیں ہے۔" آفتاب مسکرایا۔

"وہ تو ظاہر ہے۔۔۔ ہم جب بھی الجھتے ہیں، کسی خاص چکر میں ہی الجھتے ہیں۔" آصف بولا:

"اب اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جب تک انکل کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا، ہمیں یہیں رہنا ہوگا کیونکہ انکل بھی اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔ ابّا جان کسی وقت تو گھر پہنچیں گے ہی۔ ہم ابّا جان کو یہاں کے نمبر نوٹ کرا دیتے ہیں، تاکہ وہ جب بھی آئیں ہمیں فون کرلیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

پہلے انہوں نے یہی کام کیا۔ اس کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے اور اسی سلسلے میں باتیں ہونے لگیں۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ خاور جمیل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ماجد تم اپنے دوستوں سے باتیں کرو۔ میں فون سن کر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ابّا جان!" اور وہ چلے گئے۔

"یہ کس قدر حیرت انگیز اتفاق ہے۔" آفتاب کہتے کہتے رک گیا۔

"کونسے حیرت انگیز اتفاق کی بات کر رہے ہو۔ بات مکمل کیوں نہیں کرتے۔"

"آج ہی انکل اور ماجد ہمیں سڑک پر ملے۔ اور آج ہی اُن کے پر اسرار مہمان کو ڈکی میں بیٹھنا تھا۔ کیا یہ حیرت انگیز اتفاق نہیں ہے۔"

"ہاں۔ ہے تو۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ہمیں جتنے بھی اتفاقات پیش آتے ہیں، وہ حیرت انگیز اور عجیب و غریب ہی ہوتے ہیں۔"

آصف بولے۔

"تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔" آفتاب بولا۔

اسی وقت انہوں نے قدموں کی آواز سنی۔ خاور جمیل واپس آرہے تھے۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا:

"کھانا تیار ہوگیا ہے۔ آؤ پہلے کھانا کھالیں۔"

"انکل۔ کیا باہر کا دروازہ بند ہے۔"

"ہاں۔ کیوں؟" انہوں نے پریشان ہوکر کہا۔

"ہمیں محتاط رہنا چاہیئے۔"

"اوہ ہاں... ٹھیک ہے۔ تو کیا میں تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دوں۔"

"ہاں... رات ہو چلی ہے۔ آپ کا مہمان اگر چاہے تو اس وقت یہاں آسکتا ہے... اس وقت اسے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

"بہت اچھا۔ میں ڈرائیور سے کہہ کر دروازے بند کرا دیتا ہوں۔"

پندرہ منٹ بعد وہ کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے۔ لیکن ابھی انہوں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ تین میٹھی آوازوں نے انہیں چونکا دیا:

"اکیلے اکیلے کھانا..."

"کوئی اچھی..."

"بات نہیں ہے۔"

اُنہوں نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں تین بلبے تڑنگے نوجوان کھڑے تھے۔

* * * * * *

آواز سن کر انسپکٹر کامران مرزا نے پر سکون انداز میں دروازے کی طرف دیکھا۔ سٹین گن لیے تین آدمی کھڑے تھے۔ تینوں کے چہروں پر نقاب چڑھے ہوئے تھے۔

"میں جانتا ہوں انسپکٹر کامران مرزا... کہ تم پستول کی گولی کا وار بچا جاتے ہو۔ اس لیے ہم سٹین گنیں لے کر آئے ہیں۔" اگلے آدمی نے کہا:

"لیکن تم تو میرا مقابلہ شمشاد سے کرانے آئے تھے۔" کامران مرزا مسکرائے۔

"ہاں! شمشاد خاں ہی تم سے لڑے گا۔" ان میں سے پھر اسی نے کہا۔ پچھلے دو بالکل خاموش کھڑے تھے۔

"تو پھر سٹین گنیں کس لیے ساتھ لائے ہو؟"

"ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں تم بد عہدی نہ کر بیٹھو اور پولیس کو اطلاع نہ دے دو۔"

"اب تو تمہیں یقین ہوگیا ہے۔ اس لیے سٹین گنیں ایک طرف رکھ دو اور وعدے کے مطابق مجھے شمشاد خان سے لڑنے دو۔"

انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"سٹین گنیں نہیں رکھی جائیں گی۔ ہم کیا جانیں۔ تم نے فون کیا یا نہیں۔"

"شمشاد خاں سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔" انہوں نے کہا۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم پہلے ہی اپنے خفیہ ساتھی ساتھ لے کر آئے ہو۔"

"غلط خیال ہے تمہارا۔"

"بہر حال۔ ہم سٹین گنیں ہاتھ سے نہیں رکھیں گے۔ اب تم اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ میں شمشاد خان کے کان میں ایک بات کہوں گا۔ بس اس کے بعد یہ اس قدر جوش میں آ جائے گا کہ تمہیں زمین پر پٹخ پٹخ کر مارے گا اور تم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ کیا مصیبت مول لے بیٹھے ہو۔"

"جو کرنا ہے، جلدی کرو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے منہ بنا کر کہا۔

"بہت اچھا۔ عزرائیل... میکائیل... تم دونوں انسپکٹر کامران مرزا کو اپنے نشانے کی زد میں لیے رہو گے اور میں آگے بڑھ کر شمشاد خاں کے کان میں کچھ کہوں گا۔"

"نہیں نہیں۔" شمشاد خاں خوفزدہ انداز میں چلایا۔

"ارے ارے... تمہیں کیا ہوا۔" انسپکٹر کامران مرزا حیران

رہ گئے۔

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔" پہلے نے ہنس کر کہا۔

"ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا۔ تم نے اپنے ساتھیوں کے نام تو بتا دیے۔ لیکن اپنا نہیں بتایا، ویسے نام بہت چن کر رکھے ہیں۔۔۔ عزرائیل۔۔۔ میکائیل۔۔۔ بھئی واہ! اب جرائم پیشہ لوگ فرشتوں کے نام بھی رکھنے لگے۔" کامران مرزا نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا:

"ہاں۔ میرا نام بھی جاننا چاہتے ہو۔ تو سن لو۔ مجھے اسرافیل کہتے ہیں۔"

"لیکن افسوس۔ تمہارے ہاتھ میں صُور کی بجائے سٹین گن ہے۔" کامران مرزا نے منہ بنا کر کہا۔

"اس لیے کہ مجھے قیامت سے پہلے تمہارے کانوں میں صُور پھونکنا ہے اور یہ کام میری سٹین گن ہی کرے گی۔"

"تو یہ ارادے ہیں۔" کامران مرزا ہنسے۔

"ہاں!" اس نے غرّا کر کہا۔

"شمشاد خاں کے کان میں کچھ کہنے سے پہلے اگر تم میرے کان میں بھی ایک بات کہہ دو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔" انسپکٹر کامران نے عجیب سے لہجے میں کہا:

"کیا مطلب؟" اسرافیل چونکا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم خود آئے ہو۔ یا کسی نے

تمہیں بھیجا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" اسرافیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جس سے میں نے فون پر بات کی تھی، اس کی آواز تمہاری آواز سے بہت مختلف تھی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ خود نہیں آیا، اس نے اپنے تین چمچوں کو بھیجا ہے۔"

"بکو مت۔" "نہیں جانتے، تمہارے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔" اسرافیل نے جھلّا کر کہا۔

"میں سمجھ گیا۔۔۔ وہ خود نہیں آیا۔ بہت بزدل ہے وہ۔"

"وہ بزدل ہے یا بہادر۔۔۔ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔" اسرافیل کی آواز میں شدت پیدا ہو گئی۔

"بہت خوب۔۔۔ میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا، جان چکا، اب تم اپنا پروگرام شروع کر سکتے ہو۔ کاش۔۔۔ اس شو کو دیکھنے کے لیے شہر کے کچھ معززین یہاں ہوتے۔ کتنا لطف آتا انہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے ایسے انداز میں کہا جیسے کمرے میں واقعی کوئی دلچسپ کھیل شروع ہونے والا ہو۔

"اب سارا لطف تم خود ہی اُٹھا لینا۔" اسرافیل نے بھنّا کر کہا۔

"اچھا مشورہ ہے۔ میں یہی کروں گا۔" وہ مسکرائے۔

اتنے میں دو تین لمبے لمبے ڈگ بھر کر وہ شمشاد خان کے پاس

قریب پہنچ چکا تھا ۔ شمشاد خان ایک بار پھر خوفزدہ انداز میں ہکلایا ۔

" نن ... نہیں ... نہیں "

انسپکٹر کامران مرزا نے اسے بُری طرح گھور کر دیکھا ۔ وہ حیران تھے کہ اسے ہو کیا گیا ہے ۔ انہوں نے دیکھا ... اسرافیل جھک کر شمشاد خان کے کان میں کچھ کہنے لگا تھا ۔ اچانک انسپکٹر کامران مرزا بڑے زور سے چونکے ۔

انہوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا تھا ۔

خونی مقابلہ

ان تینوں کے چہروں پر شریر بچوں جیسی مسکراہٹیں تھیں ۔ اگرچہ چہروں پر غنڈوں جیسی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، جسموں پر پتلونیں اور جیکٹیں تھیں اور ہاتھوں میں سیاہ پستول ۔

" کون ہو تم ۔ اور اندر کس طرح داخل ہوئے ۔" خاور جمیل نے بوکھلا کر کہا ۔

" ہمارے نام ... " پہلے نے کہا اور جملہ نامکمل چھوڑ دیا ۔

" جیرو ... جیجا ... " دوسرے نے کہا اور اس نے بھی جملہ درمیان میں چھوڑ دیا ۔

" اور جنگو ہیں ۔" تیسرے نے جملہ مکمل کیا ۔

" یہ کیا بکواس ہے ۔ تم جملوں کے ٹکڑے کیوں کر رہے ہو ۔" خاور جمیل نے غرّا کر کہا ۔

" اس لیے کہ ظاہر میں ہم تین ہیں ... لیکن اندر سے ایک ہیں ۔ ہم جو کام بھی کرتے ہیں، مل کر کرتے ہیں ۔" تینوں نے اپنے حصّے کے الفاظ ادا کیے ۔

"دماغ نہ کھاؤ اور ایک آدمی بات کرو۔"

"بہت اچھا۔" جیرو نے مسکرا کر کہا۔ "اب صرف میں بات کروں گا۔"

"اب بتاؤ۔ تم کیا چاہتے ہو۔"

"کیا ہمارے نام سُن کر تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا۔"

"کیا نام بتائے تھے تم نے۔" خاور جمیل نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"جیرو۔۔۔ جیرا۔۔۔ اور جیجا۔"

"بھئی واہ۔۔۔ جیم کی پوری گردان ہی موجود ہے۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

اس کی آواز سُن کر جیرو اور اس کے ساتھیوں نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئے۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہمارے چہروں پر تمہیں کوئی عجوبہ نظر آگیا ہے جو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو۔" آصف نے کہا۔

"تم دونوں کون ہو۔ خاور جمیل کے لڑکے تو ہو نہیں، کیونکہ ان کا تو صرف ایک ہی بیٹا ہے۔"

"ہاں! ہم ان کے بیٹے کے دوست ہیں۔"

"اور تمہارے نام کیا ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"آصف اور آفتاب۔" آفتاب بولا۔

"بہت خوب۔۔۔ تو ننھے لڑکو۔۔۔ اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔۔۔ تم صرف دیکھو سنو اور خاموش بیٹھے رہو۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ہم اس گھر میں مہمان ہیں اور اپنے میزبانوں کا ساتھ دینا ہمارا فرض ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔۔۔ ہم جو سلوک تمہارے میزبانوں سے کریں گے۔ وہی تم سے بھی کریں گے۔"

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔" آصف مسکرایا۔

"تم نے اب تک بتایا نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو۔"

"اگر ہمارے نام سننے کے بعد بھی تم نہیں سمجھے تو سنو۔ ہم ڈاکو ہیں اور تمہارا گھر لوٹنے آئے ہیں۔ اس کے جواب میں تم یہ کہو گے کہ گھر میں نقدی اور زیورات بہت کم تعداد میں ہیں تو کوئی بات نہیں۔ تمہیں کرنا صرف یہ ہے کہ بستر پر سے اُٹھ کر دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ہم تم لوگوں کے ہاتھ اور پیر باندھ دیں گے۔ صرف تمہارے ملازم کے ہاتھ کی رسی جاتے وقت ڈھیلی کرتے جائیں گے، تا کہ کچھ دیر بعد وہ رسی کھول کر آپ لوگوں کو رسیوں سے نجات دلا سکے۔"

"خبردار۔ تم اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کرو گے، ورنہ نتیجے کے خود ذمے دار ہو گے۔" خاور جمیل نے انہیں دھمکی دی۔

"یہ ذمے داری تو ہم پر پہلے ہی عائد ہے، آپ اس کی فکر نہ

کریں اور مہربانی فرما کر دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔"

"سنو دوستو۔ جب تک تم ہم سے دو دو ہاتھ نہیں کر لیتے، ہم ہاتھ نہیں بندھوائیں گے۔" آصف نے غرّا کر کہا۔

"دو دو ہاتھ۔۔۔ اور تم کرو گے۔" جیرو نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں۔ ہم کریں گے۔" آفتاب نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"کیا تم دیکھ نہیں رہے۔ ہمارے ہاتھوں میں پستول ہیں۔"

"دیکھ رہے ہیں۔ یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ ہم ان نقلی پستولوں سے ڈرنے والے نہیں، کیونکہ اصلی پستولوں سے ہی آج تک نہیں ڈرے۔"

"کیا۔۔۔" جیرو اور اس کے ساتھیوں کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"تم نے کیا کہا۔ نقلی پستول۔" خاور جمیل نے مارے حیرت کے کہا۔

"ہاں! یہ تینوں پستول بالکل نقلی ہیں۔ ان کے ٹرائیگر دبانے سے صرف دھماکا ہوگا۔" آفتاب مسکرایا۔

"یہ غلط ہے۔ تینوں پستول اصلی ہیں۔"

"تو پھر ہم تمہیں فائر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔" آصف بولا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ لوگ یوں نہیں مانیں گے۔۔۔ لو دیکھو۔۔۔ ہم آتش دان پر رکھے گل دان کا نشانہ لیتے ہیں۔ اگر یہ گل دان اپنی جگہ سے غائب ہوگیا اور اس کے ٹکڑے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تو تم سمجھ لینا کہ پستول اصلی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ فائر کرو۔" آفتاب بولا۔

"لڑکو۔۔۔ تم واقعی بہت چالاک ہو۔ چلو۔ گل دان کی طرف دیکھو۔" جیرو نے کہا۔

نہ صرف آفتاب اور آصف بلکہ باقی لوگ بھی گل دان کی طرف دیکھنے لگے، لیکن فائر نہ ہوا۔

"کیا ہوا۔ کیا تم پتھر کے بن گئے ہو۔ یا تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔"

"یہ دونوں ہی باتیں نہیں۔" جیرو ہنسا۔

"تو پھر کوئی تیسری بات ہوگی۔ وہ کیا ہے۔" آصف نے جھلّا کر کہا۔

"صرف یہ کہ تم پر ترس آگیا ہے۔"

"کیا کہا۔ ترس آگیا ہے۔"

"ہاں۔ ورنہ فائر تو تمہارے سروں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"یار کیوں مذاق کرتے ہو۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔

"ہماری طرف مڑو۔ اور غور سے ان پستولوں کو دیکھو۔" جیرو کی آواز میں عجیب سی کھنک تھی۔

"پہلے ہی کافی غور سے دیکھ چکے ہیں۔"

"ایک بار اور۔ اس کے بعد ضرور تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

آخر انہوں نے تینوں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ پستولوں پر نظر

پڑتے ہی آصف اور آفتاب بُری طرح چونکے۔

"کیا ہوا" خاور جمیل نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"پ... پستول... اصلی ہیں" آفتاب کے مُنہ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

انسپکٹر کامران مرزا دھک سے رہ گئے تھے۔ جو کچھ ہوا، ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ تو یہ سمجھے تھے کہ سٹین گن والا واقعی شمشاد خان کے کان میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں تھی۔ یہ تو صرف ایک بہانہ تھا۔ سٹین گن والے نے تو دراصل شمشاد خان کے بازو میں ایک سوئی تیزی سے چبھو کر نکال لی تھی اور یہ بات انسپکٹر کامران مرزا سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ شمشاد خان کے مُنہ سے ایک لمبی سسکی نکلی اور پھر کامران مرزا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر شمشاد خان کا رنگ بالکل سُرخ ہو گیا۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سُرخ ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے خون ابھی ٹپک پڑے گا۔ اس کے جسم کی تمام رگیں اور مچھلیاں کھنچ گئیں۔ اب وہ ایک بہت بھیانک آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

ایسے میں سٹین گن والے کی آواز کمرے میں گونجی:

"سنو شمشاد۔ میرا نام اسرافیل ہے۔ تمہارے سامنے انسپکٹر کامران مرزا کھڑے ہیں۔ ان پر ٹوٹ پڑو اور ان کی تکا بوٹی کر دو۔"

ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا، شمشاد خان نے گھور کر انسپکٹر کامران مرزا کو دیکھا اور بجلی کی سی تیزی سے ان پر چھلانگ لگائی، لیکن کامران مرزا بے خبر تو نہیں تھے۔ فوراً ایک طرف ہٹ گئے اور شمشاد خاں سیدھا دیوار سے جا ٹکرایا۔ لیکن دوسرا لمحہ کامران مرزا کو بوکھلا دینے والا تھا۔ دیوار سے ٹکرانے کے باوجود شمشاد خاں کے منہ سے کوئی ہلکی سی چیخ تک نہیں نکلی تھی... نہ صرف یہ... بلکہ وہ پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب پھر کامران مرزا پر چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر کامران مرزا حیران ضرور ہوئے لیکن گھبرائے نہیں۔ ان کی آنکھیں شمشاد خاں پر جمی رہیں جو انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

اچانک اس نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی۔ اس مرتبہ اس کے حملے میں بلا کی تیزی تھی جیسے کوئی جنگلی درندہ حملہ کرتا ہو۔ کامران مرزا اس مرتبہ تھوڑے ہٹے ضرور تھے لیکن ساتھ ہی انہوں نے اپنی ٹانگ آگے کر دی۔ شمشاد خان ٹانگ سے ٹکراتے ہی دوسری طرف اُلٹ گیا۔ ادھر کامران مرزا کو یوں لگا جیسے ان کی ٹانگ سے کوئی لوہے کا جسم ٹکرایا ہو۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسی سوئی تھی جس نے ایک انسان کو فولاد کی طرح مضبوط کر دیا ہے۔

اور پھر اس لڑائی میں تیزی آ گئی۔ شمشاد خاں رُکے بغیر جھپٹ جھپٹ کر حملے کرنے لگا۔ انسپکٹر کامران مرزا تو گویا تتلی کی طرح ناچ

رہے تھے۔ انہوں نے اب تک شمشاد خاں پر حملہ نہیں کیا تھا،
کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حملہ کرنے کی صورت میں چوٹ انہیں ہی
لگے گی۔ دوسری طرف شمشاد خان تھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
انسپکٹر کامران مرزا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہے
تھے... سوئی کے ذریعے جو دوا شمشاد خان کے جسم کے اندر داخل
کی گئی ہے، نہ جانے اس کا اثر کب تک رہے۔ ساتھ ساتھ وہ
شمشاد کے حملوں سے خود کو بچا رہے تھے اور اس کی حرکات کو غور
سے دیکھ بھی رہے تھے۔

اچانک انسپکٹر کامران مرزا شمشاد خان کے شکنجے میں آ گئے۔
ان سے اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ شمشاد کے دونوں ہاتھوں
نے ان کی گردن کو جکڑ لیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ اپنی
گردن کو اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیں لیکن اس کے ہاتھوں کو الگ
نہ کر سکے۔

آدھ منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ان کی گردن شمشاد خاں کے
ہاتھوں میں جھول گئی اور اس نے انہیں فرش پر پٹخ دیا۔

ہار جیت

"یہ کیا بات ہوئی۔ ابھی ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پستول نقلی
ہیں" خاور جمیل نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ لیکن اب یہ نقلی نہیں ہیں" آصف مسکرایا۔

"میں نے آج تک پستولوں کو اتنی جلدی اپنی اصلیت کھوتے
نہیں دیکھا" خاور جمیل نے جھنجھلا کر کہا۔

"آپ غلط سمجھے انکل۔ در اصل ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہلے
نقلی پستول ہی تھے جب ہم نے یہ بھانپ لیا تو انہوں نے ہماری
توجہ گل دان کی طرف کرا دی۔ اور اس دوران اپنی جیبوں سے اصلی
پستول نکال لیے۔ اب ان کی جیبوں میں وہ نقلی پستول موجود ہیں"
آفتاب نے بتایا۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ لیکن تم لوگ نقلی پستول ساتھ کیوں
لیے پھرتے ہو... اور ساتھ میں اصلی بھی۔ میں نے آج تک ایسے
مجرم نہیں دیکھے جو اصلی اور نقلی پستول ساتھ رکھتے ہوں"
خاور جمیل حیران تھے۔

"چلیے آج تو دیکھ لیے۔ اب چونکہ ہمارے ہاتھوں میں اصلی پستول ہیں، اس لیے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ہم صرف آپ لوگوں کے ہاتھ اور پیر باندھیں گے اور اس کے بعد اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔"

"لیکن تم نے خالد محمود کے ہاں سے تو کچھ بھی نہیں چرایا تھا۔" اچانک آفتاب نے سوال کیا۔

"ہم عام چور نہیں ہیں۔ جس جگہ کی کوئی چیز پسند آ جاتی ہے، ہم اسے چرا لیتے ہیں، باقی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔" جیرو مسکرایا۔

"بہت خوب۔ ہو تم تینوں زندہ دل۔" آصف نے ان کی تعریف کی۔

"اچھا بس۔ تم لوگ ہمارا بہت وقت ضائع کر چکے۔ اب سیدھی طرح دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

"چلیے انکل۔ ان کی بات مان ہی لیں۔ کہیں یہ بُرا نہ مان جائیں۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔"

انہوں نے منہ دیوار کی طرف کر لیے۔ سب سے پہلے ملازم کے ہاتھ باندھے گئے۔ پھر ماجد کی باری آئی۔ خاور جمیل کے ہاتھ باندھنے کے بعد جونہی جنگو اور جیجا آصف اور آفتاب کے نزدیک پہنچے۔ ان

کے دائیں پیر دونوں کے چہروں سے ٹکرائے۔ دوسرے ہی لمحے دونوں مڑے اب ان کی پشت دیوار کی طرف تھی۔

"ہمیں باندھنا اتنا آسان نہیں۔" آصف گنگنایا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو۔ جیرو نے گرج کر کہا۔

"اگر یہ بدتمیزی ہے تو انسانوں کے ہاتھ اور پیر باندھنا کونسا تمیز کا کام ہے۔" آفتاب منہ بنا کر بولا:

"اگر اب تم نے کوئی حرکت کی تو فائر کر دوں گا۔ چلو جنگو... جیجے۔ باندھو انہیں۔"

"آؤ بھیجو باندھو ہمیں۔"

دونوں محتاط انداز میں آگے بڑھے اور پھر حیران رہ گئے۔ آصف اور آفتاب جھکائی دے کر ان کے درمیان سے نکلتے چلے گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ کمرے کے دوسرے کونے میں کھڑے نظر آئے۔

"ہاں تو مسٹر جیرو۔ کرو فائر۔"

"اب یہی کرنا ہو گا۔" جیرو نے کہا اور پستول کی نالی کا رُخ ان کی طرف کر دیا۔

"ارے ارے... کہیں فائر نہ کر دینا۔ ہم تو یونہی مذاق کر رہے تھے۔" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

"بنو نہیں۔ میں جان گیا ہوں۔ تم انسپکٹر کامران مرزا کے بیٹے

ہو - چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم یہاں موجود ہو - اچھا دیکھو - اب شرارت نہ کرنا - ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے ، ہماری دشمنی انسپکٹر کامران مرزا سے تو ہو سکتی ہے --- تم سے نہیں - ہاں اگر تم ہمارے راستے میں آئے تو ہرگز لحاظ نہیں کریں گے -" اس نے سرد آواز میں کہا -

" اچھا بھائی - تم جیتے اور ہم ہارے - ہارے اس لیے کہ تمہارے ہاتھ میں اب اصلی پستول ہیں - ان حالات میں ہم کر بھی کیا سکتے ہیں - یہ لو - باندھ لو ہمیں بھی -" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے منہ دیوار کی طرف کر لیے اور ہاتھ کمر کے پیچھے لے آئے -

خاور جمیل اور دوسرے دنگ رہ گئے - کہاں تو آفتاب اور آصف ان سے ٹکرانے چلے تھے اور پستولوں کی بھی پروا نہیں کی تھی اور کہاں وہ ایک دم ہمت ہار بیٹھے تھے - کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں کیا ہو گیا ہے - خاور جمیل سے رہا نہ گیا - انہوں نے پوچھا :

" یہ تم دونوں کو یکایک ہو کیا گیا ہے ؟"

" پتہ نہیں انکل - آپ ہی آپ ہمارے جسموں سے جان نکل گئی ہے اور اب ہمیں یوں لگ رہا ہے جیسے آئندہ کسی سے لڑ بھڑ نہیں سکیں گے ۔"

" حیرت ہے - اتنی زبردست تبدیلی سیکنڈوں میں کس طرح آ گئی ؟"

خاور جمیل کے منہ سے نکلا :

" ہم خود حیران ہیں انکل -" آصف بولا :

" بس اب اور حیران بعد میں ہوتے رہنا -" ہیرو نے کہا -

ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے - منہ کے اندر کپڑے ٹھونس کر اوپر سے رومال باندھ دیے گئے - اس کے بعد وہ تینوں مکان کے اندرونی حصے سے چلے گئے -

آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آئے - انہوں نے ملازم کے ہاتھ ڈھیلے کیے اور جانے کے لیے مڑے - پھر رک گئے اور ہیرو نے خاور جمیل کی طرف منہ کر کے کہا :

" تھوڑی دیر بعد آپ لوگ آزاد ہوں گے - ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو جو زحمت ہوئی - اس کے لیے ہم معافی چاہتے ہیں - ہو سکتا ہے ، ہم پھر بھی کسی دن آئیں ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل گئے - عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی - خاور جمیل نے بے تابی کے عالم میں ملازم کی طرف دیکھا - جیسے کہہ رہے ہوں -

" جلدی سے اپنی رسیاں کھول کر مجھے آزاد کرو - نہ جانے کس کا فون ہو ۔"

* * * * * *

" ارے ! یہ تو بہت جلد ڈھیر ہو گیا ۔" اسرافیل نے خوش ہو کر کہا -

"ہم نے تو سنا تھا، اس نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔"
دوسرا بولا:
"یہ سارا کمال تو اس انجکشن کا ہے۔ ورنہ شمشاد خاں اس کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا۔" تیسرے نے کہا۔
"اب کیا کریں۔" اسرافیل نے کہا:
"شمشاد خاں سے کہو... اسے اُٹھا کر نیچے سڑک پر پھینک دے۔" عزرائیل بولا:
"نہیں۔ باس سے اجازت لینا ہوگی۔ ان کی ہدایت کے مطابق ہی عمل کیا جائے گا۔"
"تو چلو پھر کرو فون۔"

اچانک شمشاد خاں کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ وہ بوکھلا کر پلٹے۔ شمشاد خان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ کامران مرزا اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ وہ ہکا بکا رہ گئے۔
"انسپکٹر کامران مرزا کو بے ہوش کرنا اتنا آسان نہیں۔ وہ کئی منٹ تک اپنا سانس روک سکتا ہے اور... رہی بات تمہارے انجکشن کی... تو اگر میں چاہتا تو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں شمشاد خاں کو بے کار کر سکتا تھا، لیکن چونکہ وہ بے گناہ ہے اور مجبور ہے... اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر رہا ہے۔ تمہارے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہے اور دوا کے اثر نے اس کے حواس پر قبضہ

کر رکھا ہے... اس لیے میں نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اب بھی اسے ایک معمولی سی چوٹ ماری ہے۔ جو جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ کہو۔ اب کیا حال ہے۔"
"تم اسے کس طرح بے کار کر سکتے تھے؟" اسرافیل نے حیران ہو کر پوچھا۔
"سیدھے ہاتھ کی دونوں انگلیاں اس کی آنکھوں میں دے مارتا اور وہ اندھا ہو جاتا۔ کیونکہ تمہاری دوا کم از کم اس کی آنکھوں کو فولاد کا نہیں بنا سکتی۔"
"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔ "لیکن اب تم نے اس کے سر پر کیا چیز ماری ہے۔"
"دائیں ہاتھ کی ہڈی۔ میرے اس ہاتھ کی یہ ہڈی بھی کسی طرح فولاد سے کم نہیں ہے۔ فولاد سے فولاد ٹکرائے تو چوٹ لگ ہی سکتی ہے۔"
دوسری طرف سے شمشاد خاں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اسرافیل نے اس سے کہا:
"شمشاد خاں... تمہیں کیا ہو گیا ہے... اٹھو... اور تم بھی انسپکٹر کامران مرزا کا سر توڑ دو۔"
یہ الفاظ سُن کر شمشاد خاں نے ایک جھرجھری لی... گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا لیکن دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ عزرائیل نے

آگے بڑھ کر اسے دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"یہ تو گیا کام سے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"تو کیا ہوا۔ ہمارے پاس تین سٹین گنیں ہیں اور تم اکیلے ہو۔"

"اپنی سٹین گنیں بھی آزمالو۔ کہیں تمہارے دلوں میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔ لیکن یاد رکھو۔ اس کے بعد میں تمہیں ہرگز مہلت نہیں دوں گا۔"

تینوں نے انسپکٹر کامران مرزا کے بے ہوش ہونے کے بعد سٹین گنیں میز پر رکھ دی تھیں۔ اب انہوں نے وہ جھپٹ کر اٹھالیں۔ ان کی نالوں کا رُخ انسپکٹر کامران مرزا کی طرف کر دیا گیا۔

"شاباش۔ فائر کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں دعوت دی۔

تینوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے تو یہ سُن رکھا تھا کہ اگر تین آدمی مل کر بھی کامران مرزا پر پستولوں سے فائر کریں تو وہ خود کو بچالیتے ہیں۔ اس لیے وہ سٹین گنیں لے کر آئے تھے، لیکن کامران مرزا تو انہیں سٹین گنوں سے بھی فائر کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"کیا تمہارا خیال ہے۔ یہ سٹین گنیں خالی ہیں۔"

"خالی تو نہیں ہیں۔ لیکن ان کا مقابلہ انسپکٹر کامران مرزا سے ہے، جو صرف اپنے خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ تم فائر کرو۔ اگر میری موت اسی طرح لکھی ہے تو مجھے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں سکتی۔"

اچانک انہوں نے ایک ساتھ فائر کیے۔ ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا اچھلے۔ اتنا اونچا... کہ سر چھت سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ ان تینوں پر گرے۔ بس پھر کیا تھا... انہیں سنبھلنے کی مہلت نہ ملی... کامران مرزا نے انہیں لاتوں مکّوں اور تھپڑوں کی رو پر رکھ لیا۔ صرف دو منٹ بعد ان کی سٹین گنیں ایک طرف پڑی رو رہی تھیں اور وہ دوسری طرف پڑے بُری طرح ہانپ رہے تھے۔

"اب تم مجھے اس کا فون نمبر بتاؤ... نہیں تو تینوں سٹین گنوں کی گولیاں برابر برابر تمہارے پیٹوں میں اُتار دوں گا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے غرّا کر کہا۔

وہ خاموش رہے۔ لیکن جونہی اُنہوں نے سٹین گن اٹھائی، اسرافیل چلّا اُٹھا۔

"ٹھہرو۔ اس کا نمبر 343536 ہے۔"

"یہ ہوئی نا بات... کیا یہ نمبر ڈائریکٹری میں ہے۔"

"نہیں یہ نمبر ڈائریکٹری میں موجود نہیں ہے۔"

"ہوں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ خیر۔ میں ذرا اسے فون کروں گا، تم میں سے اگر کسی نے حرکت کی تو وہ خود ذمے دار ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے نمبر ڈائیل کیے۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ پھر چند لمحوں بعد کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا:

"ہیلو ۔ کون ۔"

"کامران مرزا ۔" انہوں نے مسکرا کر کہا ۔

"کیا ۔" دوسری طرف سے کسی نے مارے حیرت کے چلا کر کہا ۔

"جی ہاں ۔ آپ کے تینوں ساتھی فرش پر پڑے ہیں ۔ اور شمشاد خاں بے چارہ تو سر پکڑے بیٹھا ہے ۔"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا ۔ شاید سننے والا سکتے میں رہ گیا تھا ۔

"کیا ہوا ... سو تو نہیں گئے آپ ۔"

"میں جاگ رہا ہوں ... اور سوچ رہا ہوں .. تمہارا کیا علاج کروں ۔" دوسری طرف سے غرا کر کہا گیا ۔

"اب خود بھی آ جائیے نا میاں ۔ ہو جائیں گی دو دو باتیں ۔"

کامران مرزا مسکرائے ۔

"اس وقت تو میں مصروف ہوں ۔ پھر دیکھوں گا ۔ تم میرے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو ۔"

"انہیں رہا بھی کیا جا سکتا ہے اور پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں ۔"

"رہا کرنے کی شرط بتاؤ ۔"

"تمہارے پاس ایک چیز موجود ہے ۔ میں چاہتا ہوں ، وہ اپنی جگہ پر پہنچ جائے ۔"

"ناممکن ۔"

"تو پھر یہ چاروں اندر ہو جائیں گے ۔"

"ہو جائیں ۔"

"اچھی بات ہے ۔" یہ کہہ کر کامران مرزا نے ریسیور رکھ دیا ۔ پھر دوبارہ کسی کے نمبر گھمائے اور فون میں کچھ کہنے لگے ۔

مجرم کا کردار

ہوٹل ذیشان کی تیسری منزل کے کمرہ نمبر ایک سو دس میں اس وقت جیرو، جنگو اور جیجا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک وہی لمبا چوڑا نوجوان اندر داخل ہوا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے کہا:

"رات کی رپورٹ کیا ہے؟"

"خاور جمیل کے ہاں بھی کچھ نہیں ملا... ہم نے اسے اور دوسرے لوگوں کو باندھ لیا تھا۔ کوئی دشواری پیش نہیں آئی البتہ آفتاب اور آصف جو اس وقت وہیں موجود تھے، ہمارے راستے میں آ کھڑے ہوئے تھے، لیکن پھر ان پر وہی ترکیب استعمال کی گئی جو آپ نے ایسے موقعوں کے لیے بتا رکھی ہے۔" جیرو نے کہا۔

"بہت خوب۔ چلو یہ اچھا ہوا، ورنہ وہ دونوں تمہارے لیے پریشانیاں کھڑی کر دیتے۔"

"جی ہاں! وہ تو کسی طرح ہاتھ بندھوانے پر تیار ہی نہیں تھے۔ انہوں نے تو ہمارے نقلی پستول بھی پہچان لیے تھے۔ مجبوراً ہمیں اصلی نکالنے پڑے۔" جیرو بولا۔

"وہ بہت چالاک ہیں..." نوجوان ہنسا۔ "تو وہ چیز وہاں بھی نہیں ملی۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہاں ضرور ملے گی۔ خیر... ابھی دو تین نام میرے پاس اور ہیں۔ تمہیں ان کے ہاں بھی یہی کارنامہ انجام دینا ہوگا۔ ابھی تک وہ شخص سات پردوں میں چھپا ہوا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے وہ چیز کسی خفیہ جگہ چھپا کر رکھ دی ہو اور اگر ہم اس کے گھر جا کر تلاش بھی کر لیں تب بھی نہ ملے..."

"نہیں... ایسی بات نہیں ہے۔ بہر حال کوشش جاری رہے گی۔ آج رات تم خورشید دلدار کے ہاں جاؤ گے۔ بہت بزدل آدمی ہے۔ زیادہ ڈرانا دھمکانا مت... لیکن اس کا ہارٹ نہ فیل ہو جائے۔ گھر میں اس کی ایک لڑکی کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ بس دونوں ہی رہتے ہیں۔ کنجوس اتنا ہے کہ بہت بڑا آفیسر ہونے کے باوجود آج تک گھر میں ملازم نہیں رکھا۔ کنجوس کے سلسلے میں اس کی زندگی کے کئی واقعے بہت مشہور ہیں۔ لوگ اسے دیکھ کر منہ پھیر کر مسکرانے لگتے ہیں۔ اس کاغذ پر باقی تفصیلات لکھی ہیں۔"

نوجوان نے کاغذ ان کی طرف بڑھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک جیرو کو کوئی بات یاد آئی۔ اس نے کہا:

"آپ نے خاور جمیل کے ملازم کے بارے میں بتایا تھا کہ

وہ خطرناک آدمی ہے۔۔۔ لیکن اس نے تو کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈالی، تمام وقت بھیگی بلّی بنا رہا۔"

"اچھا۔ خیر۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ بلا وجہ کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالے۔ ظاہر ہے کہ تم لوگ زیورات اور نقدی لوٹنے تو گئے نہیں تھے۔ اخبار نے تمہاری وارداتوں کی خبر کو بہت اچھالا ہے، نمک مرچ لگا کر بیان کیا ہے۔ اب تم لوگ مشہور ہو گئے ہو۔"

"آپ نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ آخر ہم کس چیز کی تلاش میں ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں۔ جب تم تلاش کر لوگے تو میں بتا دوں گا۔ میں نے جو ہدایات دے رکھی ہیں، انہیں نظر میں رکھ کر تلاش کرتے رہو۔"

"جی اچھا۔"

دوسرے دن کے اخبارات میں پہلے صفحے پر جیرو، جنگو اور جیجا کے ہی نام نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف انہی کے چرچے تھے۔ لوگ حیران تھے، اخبار والے حیران تھے، پولیس والے حیران تھے اور جرائم پیشہ لوگ تک حیران تھے، کیونکہ انھوں نے آج تک ایسے مجرم نہیں دیکھے تھے جو کامیابی سے گھروں میں وارداتیں کریں، لیکن گھروں سے لے کچھ نہ جائیں۔

آخر اس سلسلے میں انسپکٹر کامران مرزا کو بلایا گیا۔ محکمہ سراغرسانی کے خفیہ کمرے میں میٹنگ ہوئی۔ اس میں سبھی افسروں نے شرکت کی۔ آئی جی صاحب نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا:

"بظاہر ان وارداتوں کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا، لیکن کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہے۔ ان تینوں کے دماغ تو پھر نہیں گئے کہ وہ کسی کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔۔۔ گھر کے افراد کو رسیوں سے باندھ دیتے ہیں اور پھر پورے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔ تجوریاں اور الماریاں کھول لینے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان میں رکھی نقدی اور دوسری چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ ہے اس موضوع کا سب سے اہم سوال۔"

"ہم خود حیران ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔" ڈی آئی جی بولے۔

"اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو شاید ان کی گرفتاری بہت آسان ہو جائے گی۔" ایک افسر نے کہا۔

"کامران مرزا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" آئی جی بولے۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ تینوں کسی خاص چیز کی تلاش میں ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"وہ کیا چیز ہے۔ اور تلاش کرنے کا یہ کونسا طریقہ ہے۔"

"خدا جانے وہ کیا چیز ہے۔ تلاش کرنے کا طریقہ ضرور حیرت انگیز ہے۔ شاید انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ چیز کس گھر میں ہے۔"

لیکن انہیں کچھ اندازہ ضرور ہے۔ وہ اس اندازے کے مطابق ہی عمل کر رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اگر یہ وارداتیں اسی طرح ہوتی رہیں... تو پورا شہر بے چینی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔" ایک آفیسر نے کہا۔

"وہ کیسے۔ ابھی تک ان تینوں کی وجہ سے کسی کے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئی، کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اعتراض کیا۔

"لیکن لوگ ہر وقت ان کے بارے میں سوچتے تو رہتے ہیں۔"

"ہاں... یہ تو ضرور ہے۔ خیر... آگے فرمائیے۔"

"بس میں یہ چاہتا ہوں کہ ان تینوں کو فوری طور پر گرفتار کر لیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ان وارداتوں کا مقصد کیا ہے اور یہ کام پولیس کے بس کا نہیں ہے۔ اسے تم انجام دو گے۔" آئی جی کہتے چلے گئے۔

"جی بہت بہتر... میں آج ہی سے اس کیس کا چارج لے لیتا ہوں اور کام شروع کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد ان تینوں کو گرفتار کر لو گے۔"

"میں آج شہر کی سڑکوں پر گشت کروں گا۔ امید ہے کہ آج

نہیں تو کل پرسوں تک ان تینوں کو گرفتار کر لوں گا۔"

"بہت خوب۔"

اس کے ساتھ ہی میٹنگ برخاست ہو گئی۔ انسپکٹر کامران مرزا فارغ ہو کر گھر آئے تو آصف اور آفتاب وہاں موجود تھے۔ صبح جب وہ خاور جمیل کے ہاں سے واپس آئے تھے تو وہ دفتر جا چکے تھے۔ اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی مسکرائے اور بولے:

"تو تم بھی ان تینوں سے مل ہی لیے۔"

"جی ہاں۔ بہت شریف مجرم تھے۔" آفتاب بھی مسکرایا۔

"اب یہ کیس مجھے مل گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج رات میں شہر کی سڑکوں کا چکر لگاؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

"تو انکل۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

"کیوں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ تینوں گرفتار ہو جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

"ہاں۔ اگرچہ انہوں نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا، پھر بھی ہم یہ ضرور جاننا چاہتے ہیں۔ کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ تم بھی چلنا۔ ٹھیک آٹھ بجے جیپ یہاں

آئے گی۔ ہم اس میں بیٹھ کر چلیں گے۔"

[illegible] نے کہا اور عجیب سے انداز میں مسکرانے لگے۔ دونوں
کو ان کی یہ مسکراہٹ بہت عجیب لگی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

وہ تینوں اس وقت حوالات میں تھے جنھوں نے شمشاد خاں
کو دوا کا انجکشن لگا کر انسپکٹر کامران مرزا سے لڑنے پر مجبور کر دیا
تھا۔ البتہ شمشاد خاں اس وقت ہسپتال میں تھا۔ اس کی حالت
تو ایک گھنٹے بعد ہی ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود انسپکٹر
کامران مرزا نے اسے ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔ اس نے کہا بھی
تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

"تم ہسپتال میں محفوظ رہو گے۔ کہیں وہ لوگ تمہیں نقصان پہنچانے
کی کوشش نہ کریں۔" انھوں نے کہا تھا:

"جی اچھا۔ لیکن میری بہن کا کیا بنے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ مجرم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" انھوں
نے کہا تھا اور واپس چلے آئے تھے۔

رات کے وقت وہ گشت پر نکلنے لگے تو انھوں نے ڈرائیور
سے جیپ کا رُخ ہسپتال کی طرف موڑنے کے لیے کہا۔

"ہسپتال جا کر کیا کریں گے۔" آصف نے پوچھا۔

"رات جب تم خاور جمیل کے ہاں مصروف تھے تو میں دوسری

طرف الجھا ہوا تھا۔ میں نے اس آدمی کا تعاقب کیا تھا۔۔۔ جو
خاور جمیل کے گھر سے بھاگا تھا۔ وہ ہسپتال میں ہے۔"

"ارے۔ کیا آپ نے اسے گرفتار کر لیا ہے"

"ہاں۔ وہ بھی گرفتار ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ تین اور
بدمعاش بھی۔۔۔ لیکن ان سے بھی اصل مجرم کا پتا نہیں چلا۔۔۔ اصل
مجرم نے انہیں ایک فون نمبر دیا ہوا ہے، لیکن وہ نمبر ٹیلیفون ڈائریکٹری
میں نہیں ہے۔ اس لیے اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔"

"اور اب یہ ایک دوسری مصیبت آ پڑی ہے۔۔۔ یعنی ان
تینوں کو گرفتار کرنے کی۔" آصف نے کہا۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ انہیں تو میں جب چاہوں گرفتار
کر سکتا ہوں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" آفتاب اور آصف ایک ساتھ بولے۔

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور
کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔" انھوں نے ہنس کر کہا۔

"کمال ہے۔ تو پھر گرفتار کیوں نہیں کر لیتے آپ انہیں۔"
آصف نے حیران ہو کر کہا:

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کس
چیز کی تلاش میں ہیں ویسے بھی اب تک ان کی وجہ سے کسی کو کوئی
جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچا۔"

"لیکن لوگ الجھن کا شکار تو ہوتے ہیں، کچھ دیر کے لیے چند لوگوں کو بندھے تو رہنا پڑتا ہے۔" آفتاب بولا:

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود میں یہی چاہتا ہوں کہ انہیں ایک دو وارداتیں اور کر لینے دوں۔ پھر انہیں گرفتار کر کے ان سے یہ معلوم کیا جائے کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے۔"

"وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیا وہ اس شہر کے نہیں ہیں۔" آصف نے سوال کیا۔

"نہیں۔ ہیں تو وہ اسی شہر کے لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے ہی وہ ایک ہوٹل میں کمرہ کرایے پر لے کر رہ رہے ہیں۔"

"کیا آپ ہمیں اس ہوٹل کا نام نہیں بتائیں گے۔" آفتاب بولا۔

"کیوں... تم ہوٹل کا نام کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو۔"

"بس یونہی..."

"نام تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ مگر تم وہاں جاؤ گے نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"بھلا ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔" آفتاب جلدی سے بولا۔

"وہ ہوٹل ذیشان کی تیسری منزل کے کمرہ ایک سو دس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔" دونوں کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت جیپ ہسپتال کے سامنے رُکی۔ وہ نیچے اتر آئے۔

انسپکٹر کامران مرزا کو شمشاد خاں کا کمرہ معلوم تھا اس لیے کسی سے کچھ پوچھے بغیر وہ اس طرف بڑھنے لگے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا بُری طرح چونکے۔

"اوہ!"

"کیا ہوا۔" آصف اور آفتاب کے منہ سے نکلا۔

"گڑبڑ ہوگئی۔ شمشاد خاں کے دروازے پر پولیس کے دو آدمی پہرے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ کسی حالت میں بھی دروازے سے نہ ہٹیں۔ افسوس انہوں نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا... انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

"اور وہ گڑبڑ۔" آصف نے سوال کیا۔

"آؤ... اندر چل کر دیکھیں۔ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔" انہوں نے کہا:

تینوں کمرے میں داخل ہوئے۔ ہسپتال کے بستر پر شمشاد خاں سر سے پیر تک چادر تانے سو رہا تھا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔

"اُف خدا۔" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

"وہ لوگ اپنا کام کر گئے۔"

"کیا مطلب۔"

"ہاں۔ وہ شمشاد خاں کا کام تمام کر چکے ہیں۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے تو چادر الٹ کر دیکھا

بھی نہیں۔"

"سانس کی آمد و رفت سے پیٹ تو پھولتا پچکتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے۔ پیٹ کوئی حرکت نہیں کر رہا۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔ وہ ہکا بکا رہ گئے۔

"دوسرے... اس سرنج کو دیکھو... جو نیچے فرش پر پڑی ہے... خبردار... اسے ہاتھ نہ لگانا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے آصف کو جھکتے دیکھ کر کہا اور بولے۔

"دشمنوں نے اس سرنج کے ذریعے کوئی زہر اس کے جسم میں داخل کر دیا اور رفوچکر ہو گئے۔ لیکن گھبراہٹ میں وہ سرنج یہیں گرا گئے۔"

"کپڑا ابھی تو اٹھا کر دیکھیے۔ ہو سکتا ہے یہ سب اندازے غلط ہوں۔" آصف نے کہا:

"اچھی بات ہے۔"

انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور چہرے پر سے کپڑا الٹ دیا۔ شمشاد خان کی آنکھیں بھیانک حد تک پھیل گئی تھیں۔ منہ سے نیلے رنگ کا جھاگ بہہ کر بستر کی چادر پر پھیل گیا تھا۔ اس کا جسم اگرچہ ابھی تک گرم تھا مگر روح کب کی نکل چکی تھی۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کام ابھی چند منٹ پہلے کیا گیا ہے۔

اسی وقت انہوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ وہ چونک اٹھے۔

پھر آ گئے

دوڑ کر آنے والے دونوں کانسٹیبل تھے۔ ان کی نظر جونہی انسپکٹر کامران مرزا پر پڑی، وہ دھک سے رہ گئے اور تھر تھر کانپنے لگے۔

"کہاں گئے تھے تم دونوں۔"

"جی... ج... جی ہم۔" ان میں سے ایک ہکلایا۔

"ہاں۔ تم۔ اور کیا میں تمہارے فرشتوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"ایک نرس نے ہمیں آ کر بتایا تھا کہ آپ ہمیں ہسپتال کی کینٹین میں بلا رہے ہیں۔"

"اور تم چلے گئے۔"

"اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ نے نہیں بلایا۔" دوسرے نے لرزتے ہوئے کہا۔

"اور میں نے تمہیں کیا ہدایات دی تھیں... کوئی بھی بلائے، تم دروازے کو نہیں چھوڑو گے، تم کس قدر بے وقوف ہو۔ تمہاری وجہ سے ایک انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔"

انہیں انسپکٹر کامران مرزا بلا رہے ہیں ۔"

"جی - انسپکٹر کامران مرزا نے ہی مجھے ہسپتال کی کینٹین کی طرف جاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ دونوں کانسٹیبلوں کو وہاں بھیج دوں ۔"

"کیا !!!" وہ حیرت زدہ انداز میں چلائے ۔

"کیوں - کیا بات ہے - آپ کو یہ سُن کر حیرت کیوں ہوئی ؟" نرس نے بھی حیران ہو کر پوچھا ۔

"انسپکٹر کامران مرزا میرا نام ہے اور میں نے تمہیں ہرگز یہ نہیں کہا تھا - بلکہ میں تو ابھی ابھی یہاں آیا ہوں ۔"

"اوہ - تو یہ بات ہے ۔" نرس اور ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں ۔

"بہر حال - ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے یہ کام کیا ہے - ان میں سے ایک ذرا دیر کے لیے انسپکٹر کامران مرزا بن گیا - نرس نے ان دونوں کو پیغام دیا تو یہ کینٹین کی طرف چلے گئے اور اسی دوران دوسرا ساتھی اس کمرے میں گھس گیا - سرنج میں وہ پہلے ہی زہر بھر لائے ہوں گے - بس انجکشن لگاتے ہی وہ یہاں سے نکل گئے - کانسٹیبلوں کو جب کینٹین میں کوئی نہ ملا تو وہ واپس دوڑے آئے لیکن اتنی دیر میں شمشاد خان کا کام ختم ہو چکا تھا - بہر حال نرس بے گناہ ہے - دونوں کانسٹیبلوں نے کوتاہی سے کام لیا ہے - انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی ۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنے عملے کو فون کیا - تا کہ لاش

"اوہ !" ان کے مُنہ سے نکلا - ان کے رنگ سیاہ پڑ گئے - چہرے جھک گئے ۔

"ابّا جان - وہ نرس -" آفتاب نے جلدی سے کہا ۔

"ہاں - اس نرس کو چیک کرنا ہوگا - جاؤ اور اس نرس کو بلا کر یہاں لے آؤ ۔" انہوں نے حکم دیا اور دونوں کانسٹیبل دوڑتے ہوئے چلے گئے ۔

"اگر یہ دروازے پر سے نہ ہٹتے تو ..."

"لیکن ابّا جان ... شمشاد خان کا وقت آ چکا تھا ۔" آفتاب نے کہا ۔

"ہاں - خدا کو یہی منظور تھا ۔" ان کے مُنہ سے نکلا ۔

پھر وہ کمرے کا غور سے جائزہ لینے لگے - سرنج کے علاوہ انہیں کوئی کام کی چیز نظر نہ آئی - چند منٹ بعد دونوں کانسٹیبل اس نرس کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئے - نرس کے پیچھے ڈاکٹر بھی چلا آیا تھا - ان کے مُنہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔

"کیا ہوا جناب - خیر تو ہے ۔" ڈاکٹر کے مُنہ سے نکلا ۔

"خیر کہاں ہے - آپ کی اس نرس کی وجہ سے یہ مریض ختم ہو چکا ہے - اسے زہر کا انجکشن لگایا گیا ہے ۔"

"اوہ !" ڈاکٹر شمشاد خان پر جھک گیا ۔

"آپ بتائیے - آپ نے ان دونوں سے یہ کیوں کہا تھا کہ

اُٹھوانے اور انگلیوں کے نشانات لینے کا کام مکمل کیا جا سکے۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ گشت کے لیے روانہ ہوئے۔

جیپ میں بیٹھتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا نے کہا:

"شمشاد خاں ضرور کوئی بات جانتا تھا... اور شاید وہ اس شخص کو جانتا تھا جو ان سے یہ کام لے رہا ہے۔ اور اب اسے جلد از جلد گرفتار کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے... کہیں وہ کسی اور آدمی کو بھی نہ ختم کر دے۔"

"میری سمجھ میں تو یہ کیس سرے سے آیا ہی نہیں... شمشاد خان تو انکل خاور جمیل کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا اور اپنا کارتوسوں کا تھیلا بھول گیا تھا۔ پھر... کیا اسے کسی نے خاور جمیل کے ہاں جا کر مہمان ہونے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ جب آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس عمارت میں پہنچے تو وہ کسی کو فون پر اطلاع دے رہا تھا، اس کا تعلق ان وارداتوں سے بھی ہے۔" آفتاب کہتا چلا گیا۔

"کیس واقعی بہت الجھا ہوا ہے... لیکن جب یہ سلجھے گا تو ہر بات بخوبی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی، ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ ویسے اس کیس میں سب سے اہم بات ایک اور ہے۔ جس پر تم نے توجہ نہیں دی۔ اور کیس کا یہ پہلو نہایت دلچسپ بھی ہے۔" کامران مرزا مسکرائے۔

"آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔"

"ان تینوں ڈاکوؤں نے سب سے پہلے واردات کس کے گھر میں کی تھی۔"

"خالد محمود کے ہاں۔" آصف نے جلدی سے کہا۔

"اور دوسری واردات۔"

"انکل خاور جمیل کے ہاں۔" آفتاب نے کہا۔

"صبح اخبار میں دیکھنا... کہ تیسری واردات آج رات کس کے ہاں ہوئی ہے۔ اس کے بعد میں تم سے پوچھوں گا۔ وہ سب سے اہم بات کیا ہے۔ اگر تم نے بتا دیا تو میں یہ بات تسلیم کرلوں گا کہ تم دونوں بہت تیز ہو، ورنہ میں یہ اعلان کروں گا کہ تم دونوں بس یونہی ہو۔ اتفاق سے مشہور ہو گئے ہو۔"

"یعنی آپ ہمارا امتحان لینا چاہتے ہیں۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا:

"بالکل!"

"بہت خوب... تو پھر اس بات کا فیصلہ اب صبح ہی ہوگا۔"

اسی وقت ایک چیخ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

☸ ☸ ☸ ☸ ☸ ☸

آواز ایک سڑک کے کنارے کھڑی عمارت کی دوسری منزل سے آئی تھی... اس کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بے تحاشہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ آخر دوسری منزل پر

جا کر دم لیا۔ ابھی تک اس چیخ کی آواز کے بعد کوئی اور آواز ان کے کانوں تک نہیں آئی تھی۔

ایک کمرے کا دروازہ انہیں کھلا ملا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک نوعمر لڑکی رسیوں سے بندھے پڑے تھے۔

"ارے۔ یہ کیا ماجرا ہے" آصف کے منہ سے نکلا۔

"وہ تینوں نکل گئے شاید" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

"جی۔ کیا مطلب" "کون تینوں"

"وہی تینوں۔ بیرو، جنگو اور بیجا۔"

"اوہ۔ تو وہ آج رات یہاں آئے تھے۔ لیکن چیخ کی آواز کس کی تھی"

"ضرور ان دونوں میں سے کوئی چیخا تھا"

انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور آگے بڑھ کر انہیں کھولنے لگے۔ آصف اور آفتاب لڑکی کی رسیاں کاٹنے لگے۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔

"اف خدا۔ ہم لٹ گئے۔ وہ ہمیں لوٹ کر لے گئے" اس آدمی کے منہ سے نکلا۔

فکر نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا کچھ بھی نہیں لٹا ہوگا"

"جی۔ کیا مطلب؟" اس آدمی نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ کیا آپ دو دن سے اخبارات میں ان تین پراسرار

حملہ آوروں کے بارے میں نہیں پڑھ رہے ہیں"

"اوہ ہاں۔ یاد آیا۔ تو یہ وہ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری تمام چیزیں محفوظ ہیں"

"یہ تو دیکھنے پر ہی معلوم ہوگا"

"لیکن آپ کون ہیں۔ اور یہاں اچانک کیسے پہنچ گئے" اس آدمی نے انسپکٹر کامران مرزا کو شک کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"مجھے کامران مرزا کہتے ہیں۔ میری آج کل رات کو گشت کرنے کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔ ان تینوں کے سلسلے میں"

"کیا کہا۔ کامران مرزا" اس آدمی نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ مجھے خورشید دلدار کہتے ہیں۔۔۔ یہ میری بیٹی روحی فرزانہ ہے" یہ کہہ کر اس نے گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملائے۔ روحی نے بھی سلام کیا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" خورشید دلدار پھر بولا:

"شکریہ۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ چیخ کی آواز کس کی تھی۔ کون چیخا تھا۔ آپ کے تو منہ بھی بند کر دیے گئے تھے"

"چیخ کی آواز۔ مگر میں یا روحی تو کسی طرح بھی نہیں چیخ سکتے تھے" خورشید دلدار نے حیران ہو کر کہا۔

"اچھا خیر۔ پہلے آپ یہ تو دیکھ لیں کہ وہ آپ کی کوئی چیز تو نہیں لے گئے۔"

"اوہ ہاں۔"

"مگر انکل۔ چیخ کی آواز تو ہم نے خود اپنے کانوں سے اوپر سے آتی سنی تھی۔" آصف کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں۔ میں نے بھی سُنی تھی۔" آفتاب بولا۔

"میں خود حیران ہوں کہ آخر کون چیخا تھا۔ خیر اس پہلو پر بعد میں غور کریں گے۔ آیئے اندر چل کر دیکھیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"مگر ابّا جان۔" آفتاب نے اُلجھ کر کہا۔

"کیا بات ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اسے گھورا۔

"جب تک چیخ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ہمیں اس کمرے سے نہیں ہٹنا چاہیئے۔ آصف ۔۔۔ تم ذرا غسل خانے میں بھی ایک نظر ڈال لو۔"

"اچھا!" آصف یہ کہہ کر غسل خانے کی طرف بڑھا۔

"تم یونہی وقت ضائع کر رہے ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے مگر آصف اتنی دیر میں غسل خانے کا ادھ کھلا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول چکا تھا۔

اور پھر وہ بُری طرح چونکے۔ غسل خانے میں جیرو،

جنگو اور جیجا موجود تھے۔ جنگو اور جیجے کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ جب کہ جیرو کے ہاتھ میں ڈبّا نما ایک چیز نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے اس قدر عجیب و غریب ڈبّا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آفتاب اور آصف کی مہارت

جو کچھ سامنے آیا تھا، اچانک آیا تھا۔ چند لمحے تک کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ یوں لگا جیسے سب کے سب پتھر کے ہو گئے ہوں۔ آخر جیرو کی آواز کمرے میں گونجی:

"خبردار۔۔۔ کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، ورنہ ہم گولی مار دیں گے۔"

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔" آفتاب نے ڈرے بغیر کہا۔

"تم دونوں یہاں بھی آ پہنچے۔ رات بھی تم خاور جمیل کے ہاں موجود تھے۔" جیرو کے منہ سے نکلا۔

"کیا کریں۔ اتفاقات ہمیں ایسی جگہوں پر خود بخود لے جاتے ہیں۔" آصف نے کندھے اچکائے۔

"اور اس مرتبہ تو تمہارے والد صاحب بھی ساتھ ہیں۔ خیر۔۔۔ ہمارا آپ لوگوں سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہم جا رہے ہیں۔ خدا حافظ۔" اس نے غسل خانے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو دوست۔ تم نے ابھی ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔

پہلے یہ بتا دو کہ یہ ڈبا کیا بلا ہے۔ کیا تم اس ڈبے کی تلاش میں ہی یہ وارداتیں کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ آخر آج ہم نے یہ پا ہی لیا۔"

"اور وہ چیخ کس کی تھی۔"

"ڈبے کے ملتے ہی میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میرے منہ سے خوشی کی وجہ سے چیخ نکل گئی تھی اور وہ چیخ آپ لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی، آپ اوپر چڑھنے لگے، ہمیں غسل خانے میں چھپنا پڑا۔ ہم نے خورشید دلدار اور اس کی بیٹی کو دھمکی دے دی تھی کہ اگر انہوں نے اوپر آنے والوں کو ہمارے بارے میں بتایا تو ہم ادھر کھلے دروازے میں سے فائر کر کے ان کا کام تمام کر دیں گے۔"

"بہت خوب! تو یہ بات تھی اور یہ ڈبا کیا بلا ہے۔"

"افسوس! ہم اس ڈبے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔"

"کیوں نہیں بتا سکتے۔ کیا بڑے راز کی بات ہے۔"

"ہاں۔ بہت اہم راز کی۔" جیرو نے کہا۔

"یہ بیچارے اس لیے نہیں بتا سکتے کہ خود انہیں بھی اس کے بارے میں معلوم نہیں۔ اس ڈبے کے بارے میں تو صرف اسے معلوم ہوگا جو انہیں یہ وارداتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

"اوہ۔ تو یہ تینوں کسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اور یا پھر اس ڈبے کے بارے میں خورشید دلدار صاحب

جانتے ہوں گے، جن کے گھر سے ان تینوں کو یہ ملا ہے۔"

"میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے ۔۔۔ یہ ڈبا میرا نہیں ہے۔" خورشید دلدار نے کہا۔

"اگر ڈبا تمہارا نہیں ہے تو پھر تمہارے گھر سے کیوں ملا ہے۔" جیرو نے کہا۔

"تم جھوٹ کہتے ہو۔ یہ تم اپنے ساتھ لائے ہو گے۔ میرے گھر میں تو اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔"

"خیر نہ ہوگی۔ ہم جا رہے ہیں۔" جیرو نے آگے قدم بڑھایا۔

"ٹھہرو۔ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ یہ ڈبا ہمارے حوالے کر دو۔" آفتاب نے تیز لہجے میں کہا۔

"دیکھو۔ رات بھی تم نے اڑنے کی کوشش کی تھی اور پھر دخل دے رہے ہو۔ تمہارے ساتھ پھر وہی سلوک کرنا پڑے گا جو کل کیا تھا۔"

"کیا مطلب۔ کل تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"جب یہ نہ مانے تو میں نے ایک ہلکی سی گیس کمرے میں چھوڑ دی تھی، یہ گیس وقتی طور پر ہاتھوں پیروں میں سے جان نکال لیتی ہے۔"

"اوہ۔ تو رات یہ بات تھی۔ ہم خود بھی حیران تھے کہ ہمیں

کیا ہوگیا ہے۔"

"اب پھر تمہاری وہی حالت ہو سکتی ہے۔ اس گیس کی ٹیوبیں اب بھی میری جیب میں موجود ہیں۔ بس جیب کے اندر ہی ایک ٹیوب کا منہ کھولنا ہوگا۔"

"وہ گیس تم پر کیوں اثر نہیں کرتی۔"

"جس نے یہ گیس بنائی ہے۔ اس نے اس کا توڑ بھی تیار کر رکھا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا بھائی۔ اگر یہ بات ہے تو تم لوگ جا سکتے ہو۔" آصف بولا۔

"انسپکٹر صاحب۔ کیا آپ کے ہوتے ہوئے یہ بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" خورشید دلدار نے کہا۔

"آپ کو کیا فرق پڑ جائے گا۔ آپ کا تو یہ کچھ بھی نہیں لے جا رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن ۔۔۔ ان لوگوں نے شہر کے لوگوں کا سکون تو برباد کر رکھا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے ۔۔۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ۔۔۔ ان لوگوں کے پاس پستول موجود ہیں۔ ایسے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔"

جیرو، جنگو اور جیجا جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے اور پھر اوندھے منہ گرے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

سب ہکا بکا رہ گئے۔ خود جیرو، جنگو اور جیجا کا بھی
مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ وہ تو اطمینان سے دروازے
کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک دھڑام سے گر پڑے۔
دوسری طرف آفتاب اور آصف برابر مسکرائے جا رہے تھے۔
در اصل یہ کام ان دونوں کا تھا۔ انہوں نے اس برق رفتاری سے
اپنی ٹانگیں، ان کی ٹانگوں میں اڑائیں کہ وہ خود کو روک نہ سکے
اور یہی نہیں گرتے وقت پستول اور وہ ڈبّا بھی ان کے ہاتھوں سے
نکل گیا۔ آفتاب اور آصف دوسرے ہی لمحے تیزی سے اچھلے
تھے اور انہوں نے پلک جھپکتے میں دونوں پستول اُٹھالیے تھے
اور اب کھڑے برابر مسکرائے جا رہے تھے۔ اس ڈبے کی
طرف انہوں نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا:
"تم نے اس ڈبّے کو کیوں نظر انداز کر دیا" انسپکٹر کامران
مرزا مسکرائے۔
"ہمیں اس ڈبے سے نہیں۔ ان تینوں سے دلچسپی ہے۔
آخر یہ چاہتے کیا ہیں؟"
"جو یہ چاہتے تھے۔ وہ یہی ڈبّا تو ہے جسے تم نے اُٹھانے
کی زحمت تک نہیں کی"
"تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سارا ہنگامہ صرف
اس ڈبّے کی وجہ سے ہوا ہے"

"شاید یہی بات ہو۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا"
"خیر کوئی بات نہیں۔ پڑا رہنے دیں اسے۔ یہ کہاں جاتا ہے"
آصف بولا۔
"اب کیا پروگرام ہے" آفتاب نے سوالیہ انداز میں انسپکٹر
کامران مرزا کی طرف دیکھا۔
"میرا خیال ہے۔ یہ کہانی آج اور اسی وقت ختم ہو جانی
چاہیے، لیکن اس کے لیے افسران بالا اور کچھ اور لوگوں کو بلانا ہوگا"
"کیا مطلب" آصف نے چونک کر پوچھا۔
"جن افسران نے کیس میرے ذمے لگایا ہے، ان کی موجودگی
ضروری ہے۔ میں ان کی موجودگی میں ان تینوں کو گرفتار کروں گا"
"بہت خوب! تو پھر بلائیے"
اور کامران مرزا ٹیلیفون کرنے لگے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس
کمرے میں پندرہ بیس آدمی موجود تھے۔ ان میں آئی جی صاحب،
ڈی آئی جی صاحب، محکمہ سراغرسانی کے دوسرے آفیسر، خالد
محمود، جمیل خاور وغیرہ سبھی موجود تھے۔ جیرو۔ جنگو اور جیجا کو بھی
کرسیوں پر بٹھا دیا گیا تھا، البتہ ان پر ایک مسلح آدمی پستول
تانے کھڑا تھا۔
وہ سب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں کامران مرزا پر
جمی تھیں۔ آخر کامران مرزا کے لب ہلے۔

انسپکٹر کامران کی کہانی

"یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ آج ہی میری ڈیوٹی ان تینوں کو گرفتار کرنے کی لگائی گئی تھی اور آج ہی میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ ... لیکن معلوم یہ ہوا ہے کہ یہ تینوں کسی چوتھے کے لیے یہ کام کرتے رہے ہیں۔ وہ چوتھا کون ہے، یہ بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ یہ لوگ ایک ڈبے کی تلاش میں تھے اور اتفاق سے آج انہیں ڈبا مل بھی گیا تھا مگر عین موقع پر میں آکودا۔ اب ڈبا بھی یہاں موجود ہے اور یہ تینوں بھی۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا مسکراتے ہوئے خاموش ہوگئے۔

"سوال یہ ہے کہ یہ ڈبا ہے کیا چیز۔ جس کے مقابلے میں سونے چاندی کے زیورات اور نقدی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے اس ڈبے کے علاوہ اور کسی چیز کو بھی تو ہاتھ نہیں لگایا۔" ڈی آئی صاحب نے کہا۔

"اس کا جواب یہ تینوں تو دے نہیں سکتے، کیونکہ انہیں معلوم

ہی نہیں ہے۔ البتہ خورشید دلدار یا وہ آدمی ضرور بتا سکتا ہے جو ان سے کام لیتا رہا ہے۔ وہ چونکہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے، اس لیے قدرتی طور پر ہم یہ سوال ان سے ہی کریں گے، کیونکہ ڈبا ان کے گھر سے ملا ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا پھر خاموش ہو گئے۔ اب سب کی نظریں خورشید دلدار کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس نے تقریباً بوکھلا کر کہا:

"یہ غلط ہے۔ اس ڈبے کا مالک میں نہیں ہوں۔ یہ لوگ اسے اپنے ساتھ لے کر گھر میں داخل ہوئے ہوں گے۔ یہ تینوں ہی بتائیں گے کہ یہ ڈبا کیا بلا ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں سرکاری ملازم ہوں اور یہ ضرور مجھے بدنام کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔"

"بہت خوب۔ اور آپ کے خیال میں یہ سازش کون کر رہا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

"میں کیا جانوں۔ وہ کون ہے۔ آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ وہ ان تینوں سے کام لیتا رہا ہے۔ ظاہر ہے۔ وہی ہوگا۔"

"بہت خوب۔ لیکن ... اس طرح یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ یہ ڈبا کیا بلا ہے، اس وقت تک کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میرا خیال ہے، آپ سب حضرات اس ڈبے کو ہاتھوں میں لے کر دیکھ لیں۔ شاید

کوئی یہ بتا سکے کہ یہ کیا چیز ہے۔" آصف ڈبا اٹھا کر
باری باری سب کو دکھاؤ۔" انہوں نے کہا اور آصف نے
ڈبا اٹھا کر سب سے پہلے آئی جی صاحب کی خدمت میں پیش
کیا۔ انہوں نے اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا اور پھر
ڈی آئی جی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ سب نے دیکھنے کے
بعد نفی میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے۔ کسی کو یہ بات معلوم نہیں کہ یہ کیا چیز
ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔

کوئی کچھ نہ بولا۔ کمرے پر عجیب سی فضا طاری تھی جسموں
کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔

"اب ہم اس آدمی کو کہاں سے ڈھونڈیں۔ یہ تینوں بیچارے،
تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ ان کی زبانوں پر
تو تالے پڑے ہیں۔ پھر... اگر آپ لوگ مجھے اجازت دیں تو
میں کچھ عرض کروں۔" یہ کہتے وقت انہوں نے آئی جی صاحب کی
طرف دیکھا۔

"کیا مطلب۔ کیا تم اس ڈبے کے بارے میں کچھ جانتے
ہو۔" آئی جی صاحب چونکے۔

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"کیا جانتے ہو۔ جلدی بتاؤ۔" انہوں نے جھلا کر کہا۔

"مختصر طور پر بتانا بہت مشکل ہے۔ پوری تفصیل میں جانا پڑے گا،
تب بات سمجھ میں آئے گی۔" انہوں نے کہا۔

"کوئی پروا نہیں۔ جس قدر تفصیل میں تمہارا جی چاہے، جاؤ۔"
آئی جی صاحب جلدی سے بولے۔

"شکریہ جناب! مجھے آپ کی اجازت کی ہی ضرورت تھی...
تو سنیئے۔ یہ ڈبا ہمارے دشمن ملک نے خورشید دلدار صاحب کو بھیجا
تھا۔"

"کیا!!!" حیرت میں ڈوبی کئی آوازیں کمرے میں ابھریں۔

چند لمحے سکوت چھایا رہا۔ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے خورشید
دلدار کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ سب چونک اٹھے۔ خورشید دلدار حلق
پھاڑ کر چیخا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کیا تم مجھے غیر ملکی جاسوس ثابت
کرنے کی کوشش میں ہو۔"

"ہاں! اور آج میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"آج... تو کیا تم بہت پہلے سے اس کوشش میں ہو۔" ڈی
آئی جی صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں... یہ آج سے چھ ماہ پہلے کی بات ہے...
یہ ڈبا ایک پارسل کی صورت میں بھیجا گیا تھا، اس پہ لکھا

تھا، موسم کی پیشین گوئی کرنے والا جدید آلہ۔ احتیاطاً اسے متعلقہ حکام نے کھول کر دیکھا، لیکن ان کی سمجھ میں یہ آلہ نہ آیا۔ انہوں نے موسمیات کا اس سے پہلے ایسا آلہ نہیں دیکھا تھا لیکن چونکہ اس پہ جدید آلہ لکھا ہوا تھا، اس لیے انہوں نے پارسل خورشید دلدار کو بھیج تو دیا لیکن ساتھ ہی مجھے اطلاع دے دی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے دو آدمیوں کو خورشید دلدار کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔ خورشید دلدار نے بھانپ لیا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے فوراً شمشا خان کو فون کیا۔ وہ اس کا خاص آدمی تھا.... اگرچہ اس سے پہلے ایک بار اس نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ آئندہ جرائم سے توبہ کر لے گا، لیکن اس نے یہ وعدہ جھوٹ موٹ کا کیا تھا... اس کے بعد وہ خورشید دلدار کے لیے کام کرنے لگا تھا۔ یہ شمشاد خان کو بھی فون پر ہی احکامات دیتا تھا... یہ بات شمشاد خان کو بھی معلوم نہیں تھی کہ اس سے کام لینے والا در اصل کون ہے۔ خیر اس نے فون پر اسے ہدایات دیں۔ ان ہدایات کے مطابق شمشاد خان خالی کارتوسوں کے ایک تھیلے میں وہ ڈبا چھپا کر خاور جمیل کے گھر گیا۔ پستول کے زور پہ ان سے کہا کہ وہ ایک رات وہاں ٹھہرے گا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ جیل سے بھاگا ہوا ایک قتل کا مجرم ہے۔ خاور جمیل کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے اسے رات بھر رہنے کے لیے

خوشی سے اجازت دے دی۔ دوسری صبح وہ جاتے ہوئے تھیلا جان بوجھ کر وہیں چھوڑ گیا.... پھر خط لکھ دیا کہ اس تھیلے کو حفاظت سے رکھا جائے.... خاور جمیل خوف زدہ تھے، اس لیے انہوں نے کسی سے اس تھیلے کا ذکر نہ کیا۔ یہ سب خورشید دلدار نے اس لیے کیا تھا تاکہ اس کی ذات شک سے بری ہو جائے۔

پھر ایک رات یہ تینوں حضرات خالد محمود کے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے گھر کی تلاشی تو ضرور لی مگر چرایا کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ تجوری اور الماریاں کھولنے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو گئے تھے۔ دوسرے دن اخبارات میں جب اس حیرت انگیز واردات کی خبریں چھپیں تو خورشید دلدار چونکا۔ اس نے سوچا... ہو نہ ہو... کسی اور ملک کے جاسوس اس ڈبے کو حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔ اس نے فوراً خاور جمیل کو فون کیا اور کار میں بیٹھ کر جنگل میں آنے کے لیے کہا۔ دوسری طرف اس نے شمشاد خان کو جنگل میں بھیج دیا۔ اسے یہ ہدایت دی کہ جنگل میں جب خاور جمیل کار روکیں تو کار کی ڈکی میں چھپ جانا۔ اس طرح دن دہاڑے وہ اس کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ راستے میں آصف اور آفتاب مل گئے اور انہوں نے شمشاد خان کو ڈکی میں چھپے ہوئے بھی دیکھ لیا۔۔ لیکن اتنے

وہ مجھے اطلاع دے کر ان کے گھر پہنچے ، شمشاد خان تھیلا
وہاں سے نکال کر اپنے ایک ساتھی کے حوالے کر چکا تھا اور
جب آصف اور آفتاب وہاں پہنچے تو یہ انہیں دھمکیاں دے رہا
تھا ، مطلب یہ تھا کہ خاور جمیل اپنی زبان بند رکھیں اور کسی سے
کچھ نہ کہیں۔ وہ وہاں سے نکل بھاگا تو میں نے اس کا پیچھا کیا۔
اس نے اپنی رہائش گاہ پر جاتے ہی خورشید دلدار کو فون کیا۔
میں نے اس کے ہاتھ سے اچانک فون چھین لیا۔ در اصل میں
مجرم کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اور پھر خورشید صاحب نے مجھے
للکارا کہ وہ مجھے شمشاد خان کے ہاتھوں پٹوا سکتا ہے۔ اس
نے یہ بھی کہا کہ وہ خود وہاں آرہا ہے۔ لیکن بزدل آدمی کہاں
سامنے آسکتا ہے۔ اس نے اپنے تین بدمعاشوں کو بھیج دیا۔
انہوں نے ایک عجیب دوا سوئی کے ذریعے شمشاد خان کے
جسم میں داخل کر دی۔ جس سے وہ لوہے کی طرح مضبوط ہوگیا،
اس پر بھی میں نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے کر
ان چاروں کو گرفتار کر لیا۔ دوا کا اثر زائل کرنے کے لیے شمشاد
خان کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا لیکن اس نے ہسپتال میں
اسے ختم کرا دیا تا کہ وہ ڈبے کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔
اسی رات ان تینوں نے خاور جمیل کے گھر واردات کی لیکن تلاشی
لینے پر وہاں بھی کچھ نہ ملا اور آج رات یہ یہاں موجود ہیں...اور

یہاں سے انہوں نے ڈبا تلاش کر لیا ہے۔"
یہ لمبی چوڑی تفصیل بتانے کے بعد انسپکٹر کامران مرزا خاموش
ہو گئے۔
" لیکن سوال تو یہ ہے کہ ان تینوں کو اس کام پر مقرر کرنے
والا کون ہے اور وہ کیا چاہتا ہے ... آخر اس نے یہ چکر کیوں
چلایا ہے۔"
" ان تینوں کو اس کام پر مقرر کرنے والا آپ سب کے
سامنے موجود ہے۔ یعنی یہ خادم۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سینے
پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔
"کیا!!!" ایک بار پھر کمرہ حیرت بھری آوازوں سے گونج اٹھا۔

حیرت انگیز آلہ

"جی ہاں! یہ میں ہی تھا جس نے انہیں اس کام پر مقرر کیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خورشید دلدار کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے۔ یہ تو میں جان ہی چکا تھا کہ اس نے ڈبا خاور جمیل کے ہاں سے منگوا لیا ہے اور اب اپنے پاس رکھ لیا ہے... تاکہ ان تینوں سے محفوظ رہے، لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ڈبے کو تلاش کرنے کا کام کسی دوسرے ملک کے جاسوس نہیں، اسی ملک کے محبِ وطن سر انجام دے رہے ہیں۔"

"محبِ وطن۔ کیا مطلب؟" ڈی آئی جی چونکے۔ دوسرے بھی حیران رہ گئے۔

"جی ہاں۔ جیرو، جنگو اور جیجا... تین فرضی نام ہیں۔ دراصل یہ ہمارے محکمے کے ان آدمیوں میں سے ہیں جو مجھے ملے ہوئے ہیں۔ بس میں نے ذرا ان کے چہرے بدل دیے ہیں۔ اگر آپ ان کی مونچھیں اکھاڑ لیں اور دوسری تبدیلیاں جو میں نے کی ہیں، ختم کر دیں تو یہ صاف ستھرے محکمہ سراغرسانی کے آدمی نکل آئیں گے۔"

"اوہ!" سب کے سب دنگ رہ گئے۔

"یہی میری جیت ہے... کہ خورشید دلدار یہ سمجھتا رہا کہ کسی دوسرے ملک کے جاسوس اس ڈبے کو اڑانے کی فکر میں ہیں اور اس نے فوراً خاور جمیل کے ہاں سے ڈبا واپس منگوا لیا۔ جب کہ اس نے میرے ڈر سے ڈبا وہاں رکھ لیا تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ یہ سارا چکر میں چلا رہا ہوں تو یہ کبھی بھی ڈبا وہاں سے نہ منگواتا۔ اور جب ڈبا ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ پہنچا تو میرے آدمیوں کی نظروں سے چھپا نہ رہ سکا اور ہم نے پہلے ہی یہ معلوم کر لیا کہ خورشید دلدار نے ڈبا کہاں چھپایا ہے۔ ساتھ ہی میں نے ان تینوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ عین نو بجے ان میں سے ایک چیخے گا۔ میں اس چیخ کو سن کر اوپر آ جاؤں گا۔ چنانچہ سب کام پروگرام کے مطابق ہوا ہے۔"

"حیرت ہے... کمال ہے۔ لیکن تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ یہ ڈبا ہے کیا بلا؟"

"یہ بات خورشید دلدار بتائیں گے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مردہ سی آواز اس کے حلق سے نکلی:

"ہاں۔ میں بتاؤں گا۔ میں ہار گیا، تم جیت گئے۔ تم بہت چالاک ہو۔ میں نے تمہاری چالاکی کا غلط اندازہ لگایا تھا، تم نے

مجھے جال میں پھانس لیا۔ یہ ٹھیک ہے، میں دشمن ملک کا جاسوس ہوں اور تیس سال پہلے مہاجرین کے ساتھ مل کر یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت سے میں تمہارے ملک کے خلاف کام کر رہا ہوں۔ میں نے اب تک تمہارے ملک کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ دشمن ملک نے پچھلی مرتبہ جنگ یونہی نہیں جیت لی تھی۔۔۔ اس کامیابی میں مجھ جیسے جاسوسوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ لیکن میری تم سے ایک درخواست ہے۔ مجرم میں ہوں، سزا صرف مجھے ملنی چاہیئے۔۔۔ میری بیٹی پھولوں کی طرح پاک ہے۔۔۔ میں نے شادی یہیں آ کر کی تھی۔ اس بچی کی پیدائش کے بعد اس کی ماں مر گئی تھی۔ اس کی خاطر میں نے دوسری شادی بھی نہیں کی۔ میری درخواست ہے کہ میرے جرائم کی سزا اسے نہ ملے۔ وہ اس وقت سو رہی ہے۔۔۔ اسے ان تمام حالات سے بے خبر رکھا جائے اور اس کی تعلیم و تربیت اور شادی کی ذمے داری بھی انسپکٹر کامران مرزا آپ لیں گے۔۔۔ ورنہ میں اس ڈبے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"تم ڈبے کے بارے میں بتاؤ یا نہ بتاؤ۔ تمہاری بیٹی کو تمہارے جرائم کی سزا کسی طرح بھی نہیں دی جا سکتی۔ میں اس کی ہر طرح ذمے داری لیتا ہوں۔ بڑی ہوتے تک وہ

میرے ساتھ رہے گی۔ میں اسے اچھی تعلیم دلاؤں گا اور اس کی شادی کسی شریف اور اور برسرِ روزگار آدمی سے کر دوں گا۔ تم بے فکر رہو۔"

"بہت بہت شکریہ۔ میں اتنا احسان فراموش نہیں ہوں کہ اب بھی اس ڈبے کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ یہ مجھے دیں۔" یہ کہہ کر اس نے ڈبا لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"آصف۔ ڈبا انہیں دے دو۔" کامران مرزا نے کہا۔ آصف نے اُٹھ کر ڈبا خورشید ولدار کو دے دیا۔

اس نے ڈبا ہاتھ میں لیا۔۔۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر ایک جگہ دباؤ ڈالا۔ دباؤ ڈالتے ہی ایک ڈھکنا اوپر اُٹھ گیا۔ یہ ایک ننھی سی مشین تھی جس میں مختلف رنگوں کے بٹن لگے تھے۔

"اس سے پہلے مجھے اپنے ملک میں کوئی اطلاع بھیجنے کے لیے خطوط کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اس میں خفیہ الفاظ ہوتے تھے لیکن اس طرح اطلاع بہت دیر سے پہنچتی تھی کیونکہ دوسرے ملک کو جانے والی ساری کی ساری ڈاک چیک کرنے کے بعد بھیجی جاتی ہے۔ اس لیے میرے ملک کے سائنس دانوں نے یہ مشین ایجاد کی۔ اب میں اس مشین کے ذریعے گھر بیٹھے براہِ راست اپنے افسران سے بات کر سکتا ہوں اور انہیں خفیہ معلومات پہنچا سکتا ہوں۔ اسے ایک بہت بڑی طاقت والا

ٹرانسمیٹر کہہ لیں۔ بس ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔ فوراً ادھر
الارم بجے گا۔ اور وہ اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ایسا ہی ڈبا
موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک اور بٹن بھی لگا ہے۔
اگر میں اس بٹن کو دبا دوں تو ایک سیکنڈ کے اندر اندر سب
کچھ تباہ ہو سکتا ہے۔۔۔ میں بھی، آپ سب بھی۔۔۔ یہ عمارت
بھی اور میری بیٹی بھی۔۔۔ اس وقت میری بیٹی اس عمارت میں
نہ ہوتی تو میں یہی کرتا۔۔۔ مگر افسوس اب میں یہ نہیں کر سکتا۔"

"وہ کونسا بٹن ہے" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"سُرخ رنگ کا بٹن دبانے سے یہ ایک بم کی طرح پھٹے گا۔
لیکن اس سے پہلے سفید اور نیلا بٹن باری باری دبانے ہوں گے۔"

"بہت خوب۔ اب تم ڈبا واپس کر دو۔ ہاں تم نے یہ نہیں
بتایا کہ کون سے بٹن کو دبانے سے دوسرے ملک سے بات ہو سکتی
ہے۔"

"سبز رنگ کا بٹن۔"

"اچھا تو ذرا بات کر کے دکھاؤ۔ میرا خیال ہے۔۔۔ ابھی تو
تمہیں بات کرنے کا موقع ملا ہی نہیں ہوگا، کیونکہ چھ ماہ تک تو
یہ خاور جمیل کے گھر میں رہا ہے۔"

"نہیں۔ میں آج اس پر بات کر چکا ہوں۔"

"بہت خوب۔۔۔ تو ذرا اپنے افسروں سے رابطہ قائم کرو۔ بس

تم انہیں صرف اتنا کہو گے کہ میں آلے کو چیک کر رہا تھا۔"

"بہت اچھا۔ اب میرے انجام کے بارے میں انہیں بہت
جلد معلوم ہو جائے گا۔ اس لیے جو چاہے بات کرالیں۔"

"نہیں۔ بس تم اتنا ہی کہو گے۔ اس کے بعد ہم یہ آلہ اپنے
سائنس دانوں کے حوالے کریں گے، اور تمہاری آواز جو ٹیپ
کی جا چکی ہے۔۔۔ اس کی نقل کرنے کی مشق کی جائے گی۔ پھر
ہم تمہاری آواز میں اس ملک کو غلط اطلاعات دیا کریں گے۔
کہو کیسی رہی۔"

"میری آواز ٹیپ ہو چکی ہے۔" وہ دھک سے رہ گیا۔

"ہاں ان تینوں کے پاس چھوٹے چھوٹے ٹیپ ریکارڈ بھی
ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے جیرو، جنگو اور جیجے کی طرف مسکرا کر
دیکھا۔

"واقعی آپ بہت چالاک ہیں۔" اس نے بجھی بجھی مسکراہٹ
سے کہا۔ "لیکن میری گرفتاری کی خبر آپ کیسے چھپائیں گے۔"

"یہ خبر اس گھر سے باہر نہیں جائے گی۔ تمہارے تینوں ساتھی
پہلے ہی گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب کون رہ گیا ہے جس کی مدد
سے یہ خبر باہر جائے گی۔"

"ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ
غلط اطلاعات میرے ملک کو زبردست نقصان پہنچائیں گی۔" اس

نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تم بے وقوف ہو۔ وہ ملک بے شک تمہارا تھا... لیکن یہ ملک تمہاری بیٹی کا ہے۔ تمہیں اپنے ملک سے ہمدردی ہے یا اپنی بیٹی کے ملک سے۔"

"ہم... مجھے... اپنی بیٹی سے بہت محبت ہے... اس لیے ... اس ملک سے بھی... ٹھیک ہے، میں واقعی بے وقوف ہوں۔"

اس کا سر جھک گیا۔

چند سوال

واپسی پر آصف اور آفتاب گہری سوچ میں گُم تھے۔ آخر انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔"

"آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ اس کیس میں ایک بہت اہم بات ہے جس پر ہم نے توجہ نہیں دی... آپ کا اشارہ خالد محمود اور انکل خاور جمیل کے ناموں کی طرف تھا... اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ صبح اخبار میں یہ خبر پڑھ لینے کے بعد کہ رات کس شخص کے گھر کی تلاشی لی گئی، یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ اہم بات کیا ہے۔ اب ہم تیسرے آدمی کا نام بھی جان چکے ہیں... خورشید دلدار... اب ہم دونوں سوچ رہے ہیں کہ وہ اہم بات کیا ہے۔"

"ارے۔ تو کیا تم دونوں اب تک نہیں سمجھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے، ہم کسی حد تک سمجھ تو گئے ہیں۔"

"تو پھر بتاؤ۔"

"خالد محمود کا نام "خ" سے شروع ہوتا ہے۔ انکل خاور جمیل کا نام بھی "خ" سے شروع ہوتا ہے اور خورشید دلدار کا بھی۔"

"بہت خوب۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ خورشید دلدار بوکھلا جائے۔ اس کے لیے ضرور تھا کہ کوئی اشارہ دیا جائے۔ خالد محمود کے نام پر اگر وہ تھوڑا سا چونکا تھا تو خاور جمیل کے نام پر تو اچھل ہی پڑا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں میں نے اسے [illegible] کی مار ماری ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے پھر بولے۔

"بہر حال مجھے خوشی ہے کہ تم یہ بات سمجھ گئے ہو مگر تم میں کسی کو یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے ان تینوں کو سب سے پہلے خالد محمود کے ہاں کیوں بھیجا تھا۔"

"اب خورشید دلدار کی بیٹی کا کیا بنے گا؟"

"فی الحال تو ہم اسے سوتا چھوڑ آئے ہیں۔ میں صبح جا کر اُسے یہی سمجھاؤں گا کہ اس کے والد کو بہت ہی خفیہ طریقے پر دوسرے ملک بھیج دیا گیا تا کہ وہ وہاں ہمارے مُلک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے سکے۔ اور اسے ایک ہوسٹل میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اسے

یہ خبر سنا دی جائے گی کہ اس کا والد دوسرے ملک میں لاپتا ہو گیا ہے۔ اور اس کی کوئی خبر نہیں مل رہی ہے۔ پھر کچھ عرصہ اور گزر جانے پر میں اسے اس کے والد کی موت کی خبر دوں گا اور اس سے یہ بھی کہہ دوں گا کہ وہ اپنے والد کے بارے میں کسی سے بھی کوئی بات نہ کرے۔ ادھر ہم اس آلے کے ذریعے دوسرے ملک کا بیڑہ غرق کرتے رہیں گے۔"

"بہت خوب۔ اسے کہتے ہیں نہلے پہ دہلا۔" آصف نے خوش ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ تم تاش کب سے کھیلنے لگے۔" آفتاب نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"لعنت ہے تاش کھیلنے والے پر۔ میں نے تو محاورہ بولا ہے۔"

"محاوروں کی اتنی فضول خرچی نہ کیا کرو۔" آفتاب مسکرایا۔

"اچھا بھائی۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔" آصف نے بھی شوخ انداز میں کہا۔

"ایک بات رہ گئی۔ ہسپتال میں شمشاد خان کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"سرنج پر سے انگلیوں کے نشانات مل چکے ہیں

"ویسے میرا خیال یہی ہے کہ یہ کام خورشید دلدار نے خود کیا تھا... اگر یہ کسی اور کا کام بھی تھا تو بھی خورشید دلدار کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ اس سے ہم اگلوا ہی لیں گے۔ اس لیے اس سلسلے میں ذہن کو نہ الجھاؤ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"بہت بہتر۔ چلیے یہ بتا دیں کہ جیرو، جنگو اور جیجا یا جو کچھ بھی ان کے نام ہیں، جملوں کو آپس میں تقسیم کر کے کیوں بولتے تھے۔"

"میں نے ہی انہیں ایسا کرنے کے لیے کہا تھا، مقصد یہ تھا کہ وہ پہلی واردات پر ہی اتنے مشہور ہو جائیں کہ مجرم بوکھلا جائے۔"

"ہوں۔ یہ سارا چکر آپ کا ہی چلایا ہوا تھا... اور ان تینوں کو گیس کی ٹیوبیں بھی آپ نے ہی دی ہوں گی۔"

"ہاں!" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"مجھے تو اس لڑکی کا خیال ستا رہا ہے... جسے ہم سوتا چھوڑ آئے ہیں۔ جاگنے پر اس بے چاری کا کیا حال ہوگا؟" آصف بولا۔

"ہاں کسی کا باپ اتنے پر اسرار انداز میں چھنا ہوگا۔" آفتاب کے منہ سے نکلا۔

"کیا کیا جائے... مجرموں کو اس لیے تو معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی لڑکی یا لڑکے کے باپ بھی ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ تو اس لڑکی کے خیال میں گم ہو گئے تھے جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔